سہ ماہی

علمی و تحقیقی مجلّہ

28

نورِ معرفت

☆اداریہ
☆حلم و بردباری
☆دینی کثرتیت، ایک تنقیدی جائزہ
☆اضطراب سے مقابلے کے طریقے
☆اسلام اور غیر مسلموں سے تعلقات
☆اتحاد کی اہمیت اور تفرقہ کے نقصانات
☆اسلام کی تبلیغ میں حضرت خدیجہؑ کا کردار
☆حروف مقطعات مختلف آراء کا تجزیاتی مطالعہ
☆امت مسلمہ کے زوال اور انحطاط کے اسباب

امامؑ کا کلام، کلام کا امام

مؤمن کی صفات

اَلْمُؤْمِنُ بِشْرُهُ فِي وَجْهِهِ وَ حُزْنُهُ فِي قَلْبِهِ، أَوْسَعُ شَيْءٍ صَدْراً وَ أَذَلُّ شَيْءٍ نَفْساً، يَكْرَهُ الرِّفْعَةَ وَ يَشْنَأُ السُّمْعَةَ، طَوِيلٌ غَمُّهُ، بَعِيدٌ هَمُّهُ، كَثِيرٌ صَمْتُهُ، مَشْغُولٌ وَقْتُهُ، شَكُورٌ صَبُورٌ، مَغْمُورٌ بِفِكْرَتِهِ، ضَنِينٌ بِخَلَّتِهِ ، سَهْلُ الْخَلِيقَةِ، لَيِّنُ الْعَرِيكَةِ! نَفْسُهُ أَصْلَبُ مِنَ الصَّلْدِ وَهُوَ أَذَلُّ مِنَ الْعَبْدِ۔

یعنی: ''مؤمن کی خوشی اُس کے چہرے پر اور غم واندوہ دل میں ہوتا ہے۔اُس کا قلب، ہر چیز سے زیادہ وسیع اور اُس کا نفس ہر چیز سے زیادہ پست ہوتا ہے؛ وہ مقام و مرتبہ کی بلندی کو بُرا سمجھتا ہے اور شہرت سے نفرت کرتا ہے۔اس کا غم بے پایاں اور حوصلے بلند ہوتے ہیں۔بہت خاموش ،ہمہ وقت مصروف، شکر گذار، صابر، اپنی فکر میں غرق، دستِ طلب بڑھانے میں بخیل، خوش خلق اور نرم طبیعت ہوتا ہے۔اس کا نفس تو چٹان سے زیادہ سخت لیکن وہ خود غلام سے زیادہ عاجز ہوتا ہے۔''

(حضرت امام علی علیہ السلام، نہج البلاغہ ، کلمات قصار ۳۳۳)

بسم الله الرحمن الرحيم

اہل قلم سے اپیل

سہ ماہی "نور معرفت" ایک علمی و تحقیقی جریدہ ہے۔ یہ جریدہ ملک کے اعلی تعلیم یافتہ طبقہ کی علمی پیاس بجھانے کے لئے شائع کیا جارہا ہے۔ یہ جریدہ یونی ورسٹیوں اور دینی مدارس کے اساتذہ اور طلاب کا اپنا جریدہ ہے۔ جہاں اس جریدے کا ہدف عامۃ الناس کو علم کی ضیاء پاشیوں سے منور کرنا ہے، وہاں اس کا ایک اہم ہدف، دینی مدارس اور یونی ورسٹیوں کے اساتذہ اور طلاب کے درمیان علمی و تحقیقی شوق و جستجو پیدا کرنا اور ان کے زور قلم کو مزید نکھارنا بھی ہے۔ اس حوالے سے یہ جریدہ ہر دین دار عالم و دانشور کے علمی اور قلمی تعاون اور ان کے قیمتی مشوروں کا محتاج ہے۔ اس جریدے میں علوم قرآن و حدیث، فقہ و اصول فقہ، کلام و فلسفہ؛ اسلامی تاریخ، تقابل ادیان، تعلیم و تدریس، ادبیات، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات، اقبالیات، ثقافت و تمدن، قانون و اصول قانون وغیرہ پر اسلامی نقطہ نظر سے مقالات کے علاوہ علمی کتابوں پر تبصرے شایع کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہماری اپیل ہے کہ اپنی گرانقدر علمی آراء، تحقیقات اور نگارشات اس جریدہ کو ارسال کریں۔

چند ضروری ہدایات

- مقالہ نگار حضرات سے درخواست ہے کہ اپنے تحقیقی مقالات مدیر نور معرفت کے نام ارسال کریں۔
- بہتر ہے کہ مضمون کمپوز شدہ ہوں اور ان کی ضخامت بیس /پچیس صفحات سے زائد نہ ہو۔ ممکن ہو تو مضمون کی سافٹ کاپی بھی ارسال کریں یا مدیر کے ای۔ میل پر ارسال کی جائے۔
- ترجیحی بنیادوں پر ایسے موضوعات پر تحقیق کی جائے جو ادارہ دے۔
- حواشی اور حوالہ جات کے لئے اصلی مآخذ اختیار کریں اور مضمون کے آخر میں اس ترتیب سے لکھے جائیں: **کتاب کا نام؛ مصنف کا نام؛ پبلشر کا نام؛ سن طباعت؛ جلد؛ صفحہ نمبر۔**
- نور معرفت میں شائع شدہ مقالات کسی اور جگہ طبع کرانے کی صورت میں مجلّہ ہذا کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- مجلّہ، مقالات کی ادبی، فنّی اور ظاہری آرائش اور عبارتوں کی تہذیب کا حق رکھتا ہے۔
- ادارے کا مقالہ نگار کی تمام آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں؛ لہٰذا مجلّہ ارسال شدہ مقالات کی علمی آرائش اور تہذیب کا حق بھی رکھتا ہے۔

Declaration No: 7334
ISSN 2221-1659

جلد: ۷
جمادی الاوّل
تا
شعبان المعظم
۱۴۳۶ھ
بمطابق
اپریل تا جون
2015ء
شمارہ: ۲

سہ ماہی
علمی و تحقیقی

نور معرفت

مدیر اعلی
سید حسنین عباس گردیزی

مدیر
سید رمیز الحسن موسوی

مجلس ادارت

- ڈاکٹر شیخ محمد حسنین
- ڈاکٹر ساجد علی سبحانی
- ڈاکٹر سید راشد عباس
- ڈاکٹر کرم حسین ودھو
- ڈاکٹر علی رضا طاہر
- سید علی مرتضی زیدی
- سید ثمر علی نقوی
- روشن علی

کمپوزنگ/ڈیزائننگ بابر عباس
پرنٹر: پکٹوریل پریس، آبپارہ، اسلام آباد

قیمت فی شمارہ 130 روپے
زرِسالانہ 500 روپے
زرِسالانہ 150 ڈالر امریکہ، کینیڈا، یورپ
زرِسالانہ 070 ڈالر مڈل ایسٹ

نور الہدیٰ مرکز تحقیقات، نور الہدیٰ ٹرسٹ، محلہ سادات، بارہ کہو اسلام آباد
www.nmt.org.pk | www.nht.org.pk
E-MAIL: NOOR.MARFAT@GMAIL.COM

نوٹ: ادارے کا مقالہ نگار کی تمام آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

فہرست

نمبر شمار	موضوع	مؤلف	صفحہ
۱	اداریہ	مدیر	۷
۲	حروف مقطعات (۴) مختلف آراء کا تجزیاتی مطالعہ	ثاقب اکبر	۱۱
۳	اسلام کی تبلیغ میں حضرت خدیجہؑ کا کردار	ڈاکٹر انصار، محمد ریاض	۲۵
۴	دینی کثرتیت، ایک تنقیدی جائزہ	سید علی جواد ہمدانی	۴۳
۵	اتحاد کی اہمیت اور تفرقہ کے نقصانات (قرآن وسنت کی روشنی میں)	غلام محمد	۵۷
۶	حلم وبردباری	سید مزمل حسین نقوی	۷۱
۷	(قرآن وسنت کی روشنی میں) اضطراب سے مقابلے کے طریقے (۲)	سید عقیل حیدر زیدی	۸۱
۸	امت مسلمہ کے زوال اور انحطاط کے اسباب (امام خمینیؒ کی نظر میں)	محمد فرقان	۱۰۵
۹	اسلام اور غیر مسلموں سے تعلقات (ایک تحقیقی جائزہ)	ڈاکٹر محمد افضل	۱۲۵

"نَمُت" ایک نظر میں

" نور الہدیٰ مرکز تحقیقات"، نور الہدیٰ ٹرسٹ کا ایک ذیلی ادارہ ہے جسے بطورِ اختصار "نمت" (NMT) پڑھا لکھا جاتا ہے۔ یہ ادارہ فاضل علماء کرام اور دانشوروں کی رہنمائی میں کام کر رہا ہے اور اِسے جن شخصیات کی سرپرستی حاصل ہے اُن کی اکثریّت حوزہ علمیہ قم سے تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ، معروف انٹرنیشنل یونیورسٹیز سے بھی تعلیم یافتہ اور مختلف جامعات میں تدریس و تحقیق کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ "نمت" کو جہاں اندرونِ ملک سے علماء اور دانشوروں کی ایک ٹیم کا تعاون اور رہنمائی حاصل ہے، وہاں اسے حوزہ علمیہ قم، نجف اور مشہد مقدس کے کئی فاضل علماء کرام کا قلمی تعاون اور فکری رہنمائی بھی حاصل ہے۔

"نمت" کا نصب العین (Vision) مملکتِ خداداد پاکستان میں اسلامی تہذیب کی تشکیل کی ٹھوس فکری بنیادیں فراہم کرنا ہے۔ اسلام کی حقیقی تعلیمات کی ترویج کے ذریعے پاکستانی قوم میں دینی آگہی کا فروغ اور قومی شعور بیدار کرنا "نمت" کا مشن (Mission) ہے۔ "نمت" کے اہداف (Goals) درج ذیل ہیں:

۱۔ محققین کے درمیان رابطہ اور ہماہنگی ایجاد کرنا۔

۲۔ نشر واشاعت کے عمل میں قومی رسائل وجرائد کے ساتھ تعاون۔

۳۔ اسلامی تعلیمات کے تحقیق طلب موضوعات پر تحقیقات پیش کرنا۔

۴۔ قومی اور معاشرتی مسائل کا اسلامی تعلیمات کے نکتۂ نظر سے حل پیش کرنا۔

۵۔ ملت مسلمہ کے افراد کو درپیش عقیدتی اور فکری شبہات اور سوالات کا جواب پیش کرنا۔

۶۔ دینی مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طالبعلموں میں تحقیق کا جذبہ اجاگر کرنا۔

جہاں تک "نمت" کی پالیسیوں (Policies) کا تعلق ہے تو ملکی سالمیت اور مملکت خداداد پاکستان میں اسلامی تہذیب کی حکمرانی کی غرض سے پاکستان کے قومی نظریہ (نظریۂ توحید) کو اجاگر کرنا اور پاکستانی قوم کے اندر یکجہتی اور وحدت کا شعور بیدار کرنا، اس ادارے کی اساسی پالیسی ہے۔ "نمت" کی پالیسی یہ ہے کہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کی ترویج کے ذریعے اس قوم میں پائی جانے والی بیمار دینی سوچ کا معالجہ اور فکری پسماندگی کا خاتمہ کیا جائے؛ تاکہ یہاں اسلامی تہذیب حاکم ہوسکے۔

"نمت" کی تگ و دَو اور سرگرمیوں کا دائرہ کار محض تعلیمی، تحقیقی میدان میں فعالیت میں محدود ہے اور یہ اپنے اہداف کے حصول کے لئے مختلف اسلامی فرقوں اور مذاہب کے درمیان بین المسالک ہماہنگی، تعمیری ڈائیلاگ اور درک متقابل کا قائل ہے۔ یہ ادارہ کسی خاص شخصیت کی تصنیفات پیش کرنے کی بجائے، ہر اپنے اہداف سے ہماہنگ، ہر تحقیقی کاوش کو اپنے دامنِ نشر و اشاعت میں جگہ دینے کا عہد کیے ہے۔ ہمفکر محققین کی تربیت بھی "نمت" کی اساسی پالیسی ہے۔ لہٰذا دینی مدارس کے اساتذہ، محققین، دینی اسکالرز، کالجز، یونیورسٹیز کے طلباء وطالبات، اہل قلم اور دانشور حضرات ہمارے خاص مخاطب شمار ہوتے ہیں۔

تحقیق کے میدان میں "نمت" کا منہج بڑا واضح ہے۔ ہمارے منابع میں قرآن کریم سرفہرست ہے۔ اور ہم سنّت نبوی کے اُس طریق پر اعتماد کرتے ہیں جو ائمہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کا طریق ہے۔ ان منابع سے دینی تعلیمات کے اخذ و استخراج میں ہم مکتب تشیع کی اُس علمی تحقیقی روش کے علمبردار ہیں جو دینِ اسلام کے بنیادی منابع میں تتبّع، تفحّص اور اجتہاد کی بنیادوں پر استوار ہے۔

جہاں تک "نمت" کی کارکردگی کا تعلق ہے تو اب تک یہ ادارہ مختلف موضوعات پر 13 کتابیں اور سہ ماہی مجلّہ "نور معرفت" کے 27 شمارے (تقریباً 260 علمی، تحقیقی مقالات) پیش کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ، یہ ادارہ اب تک 7 سالانہ علمی سیمینارز کا انعقاد بھی کر چکا ہے اور ادارے کی ویب سائٹ بھی قابلِ استفادہ بنائی جا رہی ہے۔ اس ادارے نے یہ سب کام، ایک کمرے میں، نہ ہونے کے برابر وسائل کی موجودگی میں انجام دیا ہے اور ان شاء اللہ انجام دیتا رہے گا۔ تاہم ہمیں اپنے تحقیقاتی منصوبے جاری رکھنے کے لئے علماء اور اہل قلم احباب کے قلمی اور فکری تعاون کے ساتھ ساتھ ایک مستقل آفس، کم از کم 5/6 افراد پر مشتمل دفتری عملے، تحقیقاتی وسائل اور ایک ڈیجیٹل لائبریری کی اشدّ ضرورت ہے۔ لہٰذا ہم تمام علم دوست احباب کو اس کارِ خیر میں تعاون کی دعوت دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے کرم فرماؤں کو اس ادارے کے لئے بہتر سے بہتر وسائل فراہم کرنے کے توفیق عطا فرمائے! (آمین!)

ڈائریکٹر "نمت"

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین

اداریہ

نور معرفت کے پانچویں سال کا دوسرا شمارہ پیش خدمت ہے۔ نور معرفت کی ٹیم کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ اس مجلے کے صفحات قرآن واہل بیت اطہار علیہم السلام کی تعلیمات سے مزین ہوں۔ اور اس طرح کسی حد تک حدیث ثقلین پر عمل کرنے والوں کی صف میں ہمارا بھی شمار ہو سکے۔ حدیث ثقلین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری ایام مبارک میں اُمت مسلمہ کے لئے سب سے بڑی وصیت سمجھی جاتی ہے۔ جس کے مطابق آپؐ نے مسلمانوں کو اپنے بعد قرآن اور اپنی عترت علیہم السلام سے جڑے رہنے کی تاکید فرمائی اور ہر قسم کی ضلالت اور گمراہی سے نجات کو اِس تمسک کا نتیجہ قرار دیا۔

حدیث ثقلین کو تمام علمائے دین اور محدثین نے الفاظ کے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اہل سنت کی بعض کتب حدیث میں عترت اہل بیت کی جگہ سنت کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ بہر حال یہ حدیث لسان نبوت سے منقول، ایسی حدیث ہے جس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ اگر سنت کے الفاظ بھی ہوں تو اس کا عترت کے ساتھ کوئی تضاد نہیں ہے، کیونکہ عترتِ رسولؐ، سنتِ رسولؐ کے متفقہ راوی ہیں اور جس درستگی اور دقت سے عترتِ رسولؐ نے سنتِ رسولؐ کی تفسیر و تشریح بیان فرمائی ہے، ویسی کوئی اور بیان نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی شخص عترتِ رسولؐ کی عصمت کا قائل نہ بھی ہو، تب بھی ان کی صداقت وامانت، علم و معرفت اور زہد و تقویٰ پر پوری اُمت کا اتفاق ہے اور اُن کے کردار کی مضبوطی اتنی ہے کہ کسی کو انگلی اُٹھانے کی جرائت نہیں ہے۔

بہر صورت، ثقلین سے تمسک کا پہلا مرحلہ قرآن واہل بیت اطہار علیہم السلام کی تعلیمات کی نشر واشاعت ہے۔ اور یہ کام، تمام دینی اداروں، علمائے دین اور اسلامی دانشوروں کا فریضہ ہے۔ بالخصوص عصرِ حاضر کے معروضی حالات میں جبکہ اُمت مسلمہ انتہائی مشکلات و مصائب سے دوچار ہے اور اسلام کی ایسی تفاسیر پیش کی جارہی ہیں جن کا حقیقی اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہماری نظر میں اس بے راہ روی کی سب سے بڑی وجہ، اُمت کا حدیث ثقلین سے انحراف ہے۔ اگر اُمت اس حدیث کے مضمون پر عمل پیرا ہوتی تو فرمان رسولؐ کے مطابق دنیا وآخرت کی سعادت اس کا مقدر بن سکتی تھی۔ لیکن قرآن واہل بیت اطہار علیہم السلام کی رہنمائی سے منہ موڑنے کی وجہ سے آج اُمت جہاں دنیوی ترقی اور پیشرفت سے محروم ہے، وہاں اس کی آخرت بھی تباہ ہے۔

ایک طرف برسوں سے فلسطین کے مظلوم مسلمانوں پر اسرائیلی جارحیت جاری ہے تو دوسری طرف یمن کے مظلوم مسلمانوں پر پچھلے دو اڑھائی ماہ سے مسلسل بمباری کا سلسلہ رکنے نہیں پا رہا۔ امریکہ و اسرائیل اور اُن کے اتحادی بعض عرب ممالک کے حمایت یافتہ القاعدہ، داعش، النصرہ اور طالبان جیسے دہشت گرد گروہوں نے عراق، شام، پاکستان اور حجازِ مقدس میں ہزاروں مسلمانوں کو اپنی سفاکیت اور دہشت گردی کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ برما میں مسلمانوں کی نسل کشی جاری ہے۔ ان سب مظالم پر امّتِ مسلمہ کی مجرمانہ خاموشی، بلکہ یمن، شام اور عراق کے مسائل میں ظلم و بربریّت کی حمایت، اُمت کی قرآن و عترت سے دوری کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ امّت برسوں سے فلسطین کے مظلوم مسلمانوں پر اسرائیل کی طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم پر خاموش نہ رہتی تو آج شام، عراق، یمن اور برما میں مسلمان بچوں، بوڑھوں اور عورتوں پر یلغار کا نہ رکنے والا سلسلہ جاری نہ ہوتا۔ جو امت نام نہاد مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل و غارت کا سلسلہ نہیں رکوا سکتی، وہ برما جیسے ملک میں غیر مسلموں کے ہاتھوں مسلمانوں کی نسل کشی کیسے بند کروا سکتی ہے؟

سابقہ دنوں میں حجاز کے شہر قطیف اور ایک دوسرے علاقے میں شیعہ مسلمانوں کی مساجد پر دہشت گردی کے واقعات میں بیسیوں نمازیوں کی شہادت اُمت مسلمہ کی تلخ ترین تاریخ کے سیاہ ترین صفحات ہیں جس نے جنگیز وہلاکو کے مظالم کو بھلا دیا ہے۔ سعودیہ میں ایک بظاہر مقتدر حکومت کے برسرِ اقتدار ہوتے ہوئے داعش کا دہشت گردی کی کاروائیاں کرنا، رائے عامہ کی سمجھ سے بالاتر ہے! ایک عام انسان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ کہیں ان واقعات کے پیچھے خود سعودی حکومت کا ہاتھ تو نہیں ہے؟ بہر حال آج علمائے اسلام کا یہ فریضہ ہے کہ غور کریں کہ وہ اسلام جو امن وسلامتی کا دین ہے، اس کے ماننے والے یہ خون چکاں تاریخ کیوں رقم کر رہے ہیں؟ آج پاکستان، افغانستان، عراق، شام، برما، بحرین، یمن اور خود سرزمینِ وحی پر مسلمانوں کا خون کیوں اتنا ارزاں ہو چکا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اس الٰہی دین کے سچے پیروکار نہیں رہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پوری انسانیت کے لئے امن وسلامتی اور رحمت کا دین بنا کر بھیجا ہے؟

نورِ معرفت کا یہ شمارہ ماہ مبارک رمضان کے تقریباً وسط تک قارئین کی خدمت میں پہنچے گا۔ بدقسمتی سے امسال ماہ رمضان سے پہلے حکومتی بجٹ کا سامنے آنا اور بجٹ میں عام آدمی کی سمجھ سے باہر اعداد و شمار کے پردے میں نامرئی مہنگائی کا طوفان، اس قوم کی مظلومیت کا ایک اور باب ہے۔ یقیناً اشرافیہ طبقہ اس مہنگائی کو محسوس نہیں کرے گا۔ کیونکہ جن گھرانوں میں ایک دن میں اتنا کھانا پکتا ہو کہ جو پاکستان کے

پچانوے فیصد عوام کے مہینے بھر کے کھانے کے برابر ہو وہ مہنگائی کا درد کیا جانیں۔ یہ درد تو اُن لوگوں کو محسوس ہوتا ہے جو تمام دن محنت کے بعد بھی اپنے کنبے کو پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھلا سکتے۔ بہر صورت، پاکستانی حکومت کا غریب کش بجٹ، سخت گرمیوں کے موسم میں ماہ مبارک میں روزہ داروں کے لئے ایک اضافی آزمائش ہے جس سے یہ قوم ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سرخرو ہو کر نکلے گی۔

بد قسمتی سے ہماری قوم عادی مظلوم بن چکی ہے۔ اگرچہ ہم اعتقادی طور پر دینِ محمدیؐ کے قائل ہیں لیکن عملی طور پر ہم تحریف شدہ دین عیسائیّت کے ماننے والے ہیں جس کے مطابق اگر کوئی شخص تمہارے ایک گال پر تھپڑ مار دے تو اپنا دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دو۔ دین محمدیؐ کی تعلیم تو یہ ہے کہ "نہ ظالم بنو، نہ مظلوم!" لیکن ہم نے قرآن مجید کبھی عمل کی نیت سے پڑھا ہو تو ہمیں اس زندگی ساز قرآنی اُصول کا پتا چلے۔

ہماری قوم کو آزادی کے پہلے دن سے ہی آزادی کی ایسی سزا دی جارہی ہے کہ آزاد اقوام کی سی زندگی گزارنا تو کجا، ہم آزادی کا مفہوم ہی بھول چکے ہیں۔ تعلیم وتربیت کا فقدان، مناسب مکان ورہائش کا میسر نہ ہونا، اجتماعی آداب وثقافت اور زندگی کی بنیادی ترین ضروریات تک سے محرومی، اس قوم کے مقدر میں لکھی جاچکی ہے۔ ہمارے ان تمام مصائب کا اصل سبب، پاکستان پر اشرافیہ طبقے کا تسلط ہے جو ہر پانچ سال کے بعد باری باری اس قوم پر مسلط ہو کر لوٹ مار اور ظلم وستم کے عالمی ریکارڈ توڑ رہا ہے۔ ادھر عوام کی بے شعوری کا عالم یہ ہے کہ انتخابات کے ہر موقع پر اسی طبقہ کا انتخاب کرکے اسے اسمبلیوں میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس کی حالیہ مثال گلگت وبلتستان کے انتخابات ہیں جہاں حکمران جماعت نے واضح انتخابی برتری حاصل کر لی ہے۔ یہ عوام کی بے شعوری ہے یا ہمارے انتخابی نظام کا کمال ہے کہ جس میں اشرافیہ طبقے اور مقتدر گروہوں کے علاوہ کسی اور کے لئے ایوانِ اقتدار تک پہنچنے کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔

گلگت وبلتستان کے انتخابات ہماری مذہبی اور نظریاتی سیاست کی دعویدار جماعتوں کے لئے لمحہ فکریہ ہیں۔ ان انتخابات میں ہماری مذہبی قیادت کا رویّہ انتہائی مایوس کن رہا ہے۔ اگر یہ جماعتیں ملت کے مفادات کو مدّ نظر رکھتیں اور اپنی جماعتی پسند وناپسند اور مفادات کو نظر انداز کرتیں تو آج انتخابی نتائج کچھ اور ہوتے۔ ہماری نظر میں یہ سیاست، سراسر غیر الٰہی اور مفاد پرستانہ ہے اور ملت کے ہر فرد کی طرف سے ایسی سیاست کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔ یہاں بعض مذہبی شخصیات اور علمائے دین کا انتخابات کی سیاست کے خلاف ایک مخصوص موقف

بھی قابل خدشہ ہے۔ موجودہ سیاسی عمل میں شرکت کیے بغیر اس طاغوتی نظامِ سیاست میں ایک بہت بڑے سیاسی انقلاب کا خواب دیکھنا، محض ایک خواب ہی ہے۔خلاصہ یہ کہ ہمیں پاکستان کے موجود سیاسی نظام میں اسلامی سیاست کے طریقہ کار کے بارے میں مزید گہرائی سے سوچنے کے ساتھ ساتھ گلگت وبلتستان کے عوام کو اُن کے آئینی حقوق دلانے کو اپنا اصل ہدف قرار دینا چاہیے۔

لہٰذا دین کا درد رکھنے والے علماء، دانشوروں اور اداروں کا سب سے بڑا فریضہ یہی ہے کہ وہ قرآن اور اہل بیت اطہار علیہم السلام کی حقیقی تعلیمات کو عوام الناس تک پہنچائیں اور اُن میں دین فہمی کے ذریعے آبرومندانہ زندگی گزارنے کا راستہ ہموار کریں۔ پیغمبر اسلام ﷺ اور آپؐ پر نازل ہونے والی آخری الٰہی کتاب کی تعلیمات پوری انسانیت کے لئے آبرومندانہ زندگی کا پیغام ہیں۔ اگر ہم اس پیغام کو سمجھیں اور اِسے اُس حقیقی سرچشمہ سے حاصل کریں جس کی نشاندہی پیغمبر اسلام ﷺ نے حدیثِ ثقلین میں فرمائی ہے تو یقیناً ہم گمراہی سے بچ جائیں گے۔

نور معرفت کے اس شمارے میں چند پرانے لکھنے والوں کے علاوہ کچھ نئے اہلِ قلم کے تحقیقی مقالات بھی پیش کیے جارہے ہیں جو یقیناً ہمارے قارئین کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کا سامان فراہم کریں گے۔ ہم اپنے تمام مقالہ نگاروں کے شکر گزار ہیں۔ نیز ہمیں آپ قارئین کی تنقیدی آراء اور مشوروں کا بھی انتظار رہتا ہے۔ امید ہے ہمارے قارئین ہمیں اپنی قیمتی آراء سے آگاہ فرمائیں گے۔

☆☆☆☆☆

حروف مقطعات(۴)

مختلف آراء کا تجزیاتی مطالعہ

ثاقب اکبر*

ukhuwat@gmail.com

کلیدی کلمات: اسمائے نبوی، اعداد، قرآنی قَسمیں، حی بن اخطب

خلاصہ

حروف مقطعات کے بارے میں عربی اور فارسی میں کافی کام ہوا ہے جس میں فلاسفہ اور عرفاء کے نظریات بہت اہم ہیں۔ جبکہ اُردو میں اس موضوع پر بہت کم کام ہوا ہے۔ بعض نے تو ان حروف کے بارے میں غور و فکر کرنے کو بھی وقت کا ضیاع قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ حروف قرآن مجید کی بہت سی سورتوں کے شروع میں آئے ہیں اور ان میں حیرت انگیز معانی و مطالب ملتے ہیں۔ ایسے میں ان کے بارے میں سنجیدہ مطالعے اور غور و فکر کے بجائے دوسروں کو بھی ان پر گہری نظر ڈالنے سے روکنے کے لیے کہا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس موضوع پر اصحاب دانش و بصیرت کی توجہ مبذول کرنے کے لیے چند مطالب مرتب کرکے پیش کرنے کی ایک کمزور سی کوشش کی ہے۔

اس سلسلے میں قبل ازیں دو اقساط میں بارہ آراء و نظریات پیش کیے گئے ہیں اور اب کچھ مزید مطالب پیش کیے جا رہے ہیں۔ تیرہواں نظریہ یہ ہے کہ حروف مقطعہ آنحضرتؐ کے اسماء ہیں۔ اس کے بعد چودہواں نظریئے میں ان حروف کو بطور قَسموں کے متعارف کرایا گیا ہے۔ یعنی یہ حروف قسمیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کھائی ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ ان حروف کے ذریعے قسم کھاتا ہے کہ قرآن اس کا کلام ہے۔ پندرہویں رائے یہ ہے کہ یہ حروف اُمتوں اور قوموں کی مدت عمر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اسی بنیاد پر بعض حساب لگانے والوں کی رائے ہے کہ امت اسلامیہ آخری زمانے تک باقی رہے گی اور قیامت تک ختم نہ ہوگی۔ لیکن بعض محققین نے اس رائے کو بہت ہی کمزور قرار دیا ہے۔

*۔ صدر نشین، البصیرہ، اسلام آباد

مقدمہ

قبل ازیں ہم تین قسطوں میں قرآن حکیم کے حروف مقطعات کے بارے میں مختلف آراء اور ان کا تجزیہ قارئین" نور معرفت" کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں۔ پیش نظر قسط اس سلسلے میں ہماری معروضات کا آخری حصہ ہے۔ جو موضوعات قبل ازیں زیر بحث آچکے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

1) یہ حروف متشابہات میں سے ہیں۔
2) حروف مقطعہ سورتوں کے نام ہیں۔
3) یہ حروف پورے قرآن کے نام ہیں۔
4) یہ حروف فکر و عقل کے اول مخلوق ہونے کی طرف اشارہ ہیں۔
5) حروف مقطعہ پیغمبر اکرمؐ کو متوجہ کرنے کے لیے ہیں۔
6) یہ حروف تحدی کی حیثیت رکھتے ہیں۔
7) صحابہؓ کو ان حروف کا معنی معلوم تھا۔
8) حروف مقطعہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے مابین رمز ہیں۔
9) حروف مقطعہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں۔
10) حروف مقطعہ: سامان فکر انگیزی ۔
11) حروف مقطعہ معانی اور اشیاء پر دلالت کرتے ہیں۔
12) یہ حروف کفار کو خاموش کرنے کے لیے نازل ہوئے۔
13) حروف مقطعہ آنحضرتؐ کے اسماء ہیں۔
14) یہ حروف قسمیں ہیں۔
15) یہ حروف امتوں اور قوموں کی مدت عمر کی طرف اشارہ کرتے ہیں

پیش نظر گذارشات میں ہم چند آراء پر کچھ تفصیلی گفتگو کریں گے اور دیگر چند آراء کا خلاصہ پیش کریں گے۔ ہمارا آخری حصہ ان تمام آراء کے کلی جائزے اور مختلف آراء کی ایک دوسرے سے مطابقت کے حوالے سے ہے۔ اس حصے میں حروف مقطعات کے بارے میں متقدمین و متاخرین کی آراء کے مطالعے سے کلی نتائج

اخذ کیے گئے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آئندہ بھی حروف مقطعات پر غور و فکر جاری رہے گا اور ہر دور میں ان کے بارے میں نئے نظریات اور نئے حقائق سامنے آتے رہیں گے جو قرآن حکیم کے دائمی معجزہ ہونے پر نئی سے نئے ادلہ کی حیثیت کے حامل ہوں گے۔

16)　حروف مقطعات اسرار الٰہی کا مقدمہ ہیں

متعدد مفسرین نے حروف مقطعات کو اسرار الٰہی کا مقدمہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف تعبیرات اختیار کی گئی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مفردات کے ذریعے سے انسان کو کلمات کے فہم کی طرف لے جاتا ہے۔ بعض نے اس امر پر زور دیا ہے کہ حروف مقطعات جو اوائل سور میں آئے ہیں اگر انسان ان کے راز کو نہ پاسکے تو گویا مابعد تک اس نے رسائی حاصل نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نے ان حروف کو مفاتیح قرار دیا ہے۔ گویا یہ وہ کنجیاں ہیں جن کے ذریعے سے بعد میں آنے والے اسرار الٰہی انسان پر بعد میں کھلتے ہیں۔ ایسی باتیں عام طور پر عرفاء نے کی ہیں۔ سطور ذیل میں ہم چند مفسرین کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔

ابن عربی کا نظریہ

اس سلسلے میں ابن عربی کے نظریے کی تفصیلات ہیں لیکن ہم ڈاکٹر حسن الدین احمد کا بیان کردہ خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ ابن عربی، تفسیر روح المعانی، میں کہتے ہیں:

"اس حقیقت کو جان لینا چاہیے کہ حروف مقطعات کی اصلیت سے اصحاب عقل و خرد ہی بہرہ ور ہیں۔ جن سوروں کے آغاز میں ایسے حروف وارد ہوئے ہیں ان کی تعداد انتیس (۲۹) ہے۔ انتیسواں وہ قطب ہے جس پر آسمان قائم ہے اور وہ علت وجود ہے۔ قرآن میں یہ قطب آل عمران کا آغاز المO اللہ ہے اگر یہ قطب نہ ہوتا تو باقی اٹھائیس سورتیں قائم نہ رہ سکتیں۔

حروف مقطعات مکررات سمیت اٹھتر ہیں۔ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: الایمان بضع وسبعون۔ (ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں) اس میں بضع سے مراد آٹھ ہیں۔ ایمان کی شاخوں کی طرح حروف مقطعات کی تعداد بھی اٹھتر ہے۔ اس لیے جب تک کوئی شخص حروف مقطعات کی حقیقت سے آگاہ نہ ہو وہ اسرار ایمان کا واقف نہیں ہو سکتا۔" (1)

عین القضاۃ ہمدانی کا نظریہ

عین القضاۃ ہمدانی کا شمار عظیم المرتبت عرفاء میں ہوتا ہے۔ حروف مقطعات کے بارے میں ان کا نظریہ اس حوالے سے خاص شہرت رکھتا ہے۔ ہم ان کے چند کلمات ذیل میں نقل کرتے ہیں: ''پنداری قرآن دانسته ای؟ ۔۔۔۔ تا حروف بندانی کلمه چوان بدانی؟'' یعنی ''تم سمجھتے ہو کہ تم نے قرآن سمجھ لیا ہے۔ ایک مرد کے نزدیک قرآن جاننا یہ ہے کہ کھیعص، الم، طہ، یس کو جانو کیونکہ اگر اس کی بدایت و ابتدا کو نہ جانو تو اس کی نہایت کو کیا سمجھوگے کہ کیا ہے۔ لم یزل ولایزال کے جلال وقدر کی قسم کہ یہ فصل جو میں نے لکھی ہے حاصل ذوق ہے۔۔۔ جب ''حروف'' ہی کو نہیں جانتے ہو تو ''کلمہ'' کو کیا جانوگے۔''

ملا صدرا کا نظریہ

ملا صدرا کے نزدیک بھی ان حروف سے آگاہی فہم قرآن کا مقدمہ ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

''ایها السالك المسكين، ان اول ما یرتسم فی لوح القاری المبتدی، حروف التهجی لیستعد بذلك لتلاوة الآیات المكتوبة فی الصحیفة القدسیة۔'' (2)

''اے سالک مسکین! جس چیز کا نقش مبتدی قاری کی لوح پر قائم ہوتا ہے وہ حروف تہجی ہیں تاکہ صحیفہ قدسیہ میں مکتوب آیات کی تلاوت کے لیے وہ آمادہ ہو جائے۔''

ایک اور مقام پر اپنے اس نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''فقد انجلی لك ایها المسكین أن ما ارتسم فی لوح السالك المبتدی حروف أبجد لیستعد بذلك الانتقاش بمفاد قوله اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِی۔۔۔ وعند ذلك یسهل علیه معرفة القرآن و تعلم لفظه و معناه و منطوقه و فحواه وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔'' (3)

''پس اے مسکین! جب تمھارے لیے وہ کچھ روشن ہو جاتا ہے جو مبتدی سالک کی روح پر حروف ابجد کی صورت میں نقش ہوتا ہے تاکہ اس نقش ہونے سے وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کو سمجھنے کے قابل ہو جائے اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِی۔۔۔ (4) اور ایسا ہونے کے بعد اس پر قرآن کی معرفت آسان ہو جائے اور تو جان لے اس کے لفظ کو، معنی کو، منطوق کو اور اس کی مراد کو اور (وَلَقَدْ

يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ) (5) تحقیق ہم نے قرآن کو ذکر اور یاد آوری کے لیے آسان کر دیا تو کیا کوئی ہے متوجہ ہونے والا؟

17) صاحبان نسخ کے اسماء کا مخفف

بعض مستشرقین کی رائے میں حروف مقطعات ان صحابہؓ کے ناموں کا مخفف ہیں جن کے نسخوں کی مدد سے قرآن حکیم کی تدوین کی گئی ہے۔ اس رائے کا سب سے پہلے اظہار معروف مستشرق نولڈکے نے اپنی کتاب ہسٹری آف قرآن میں کیا۔ ان کی یہ کتاب پہلی مرتبہ 1860ء میں منظر عام پر آئی۔ انھوں نے اس کتاب میں اس نظریے کا اظہار کیا کہ حروف مقطعہ قرآن کے متن کا حصہ نہیں ہیں بلکہ ان مسلمانوں کے ناموں کا مخفف ہیں جنھوں نے رسول اسلامؐ کی زندگی میں اپنے لیے قرآنی سورتوں پر مشتمل نسخے تیار کیے اور جب حضرت زید بن ثابت نے قرآن کی جمع آوری کی تو انھوں نے قرآن کے خطی نسخوں کے مالکان کے ناموں کو بطور علامت باقی رکھا۔ مثلاً "الر" میں (ز) کے بجائے (ر) استعمال کیا گیا ہے اور یہ الزبیر کا مخفف ہے۔ "المر" المغیرہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ "حم" عبدالرحمٰن کے نام کا مخفف ہے۔

نولڈکے کا کہنا ہے کہ بعد میں آنے والے مسلمان ان علامتوں کے معنی نہ جانتے تھے اور اتفاقیہ طور پر یہ متنِ قرآن میں باقی رہ گئے ہیں۔ اس مفروضے کی بنا پر یہ فقط کسی نسخے کی ملکیت کو ظاہر کرنے کے لیے سادہ سی علامتیں ہیں جو غور وخوض کے نہ کرنے کی وجہ سے متن قرآن میں لکھے جاتے رہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر سید کاظم طباطبائی نے ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا ہے جس کا عنوان ہے "حروف مقطعہ از منظر قرآن شناسان غربی"۔ (6) یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ نولڈکے کی کتاب کا جب دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو ان کی رائے تبدیل ہو چکی تھی۔ اگرچہ یورپ میں اس رائے کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن "مسٹر شوالی" کی کوششوں سے شائع ہوا۔ جس میں یہ مفروضہ موجود نہیں ہے لیکن بعد ازاں "ایچ ہر شیفلڈ" نے یہ نظریہ اختیار کر لیا۔ 1901 میں ان کی کتاب شائع ہوئی تو انھوں نے اس نظریے کی حمایت کی۔ تاہم انھوں نے ان میں سے ہر حرف کے لیے اپنی طرف سے مختلف صحیفوں اور نسخوں کے مختلف مالکوں کے لیے علامتوں کا ذکر کیا۔ "ر" کو انھوں نے بھی "ز" کا مترادف قرار دے کر زبیر کی علامت کہا۔ "م" ان کے نزدیک مغیرہ کا مخفف ہے۔ "ح" حذیفہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ "ص" حفصہ کی علامت ہے۔ "ک" ابو بکر کے لیے آیا ہے۔ "ھ" ابو ہریرہ، "ن" عثمان، "ط" طلحہ اور "س" سعد بن ابی وقاص کی علامت ہے۔ ان کے نزدیک "ع" عمر، علی، ابن عباس یا عائشہ کی

حکایت کرتا ہے۔ "ق" قاسم بن ربیعہ کے لیے آیا ہے۔اہم ترین بات یہ ہے کہ یہ نظریہ کوئی تاریخی شاہد نہیں رکھتااور فقط انسانی ذہن کاساختہ پرداختہ ہےجب کہ ایسے نظریے کے لیے ضروری ہے کہ اسے کسی تاریخی ثبوت کے ساتھ پیش کیاجائے۔ثانیاًنولڈکےاورہر شیفلڈ دونوں نے مختلف حروف کے لیے مختلف افراد تجویز کیے ہیں۔

اس نظریے پر استاد جوادی آملی کی آرا قابل غور ہیں۔ان کی آراء کا خلاصہ یہ ہے:

1. یہ نظریہ ایک باطل بنیاد پر استوار ہے کیونکہ اس کے مطابق یہ حروف اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں بلکہ نص قرآنی پر اضافہ ہیں۔ اس طرح سے یہ نظریہ مسلمانوں کے اس اجماع کا مخالف ہے جس کے مطابق موجودہ قرآن میں کوئی کمی بیشی واقع نہیں ہوئی۔
2. جیساکہ روایات میں بھی آیا ہے اور تاریخ میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے کہ خود پیغمبر اکرمؐ ان حروف کی تلاوت کیا کرتے تھے۔
3. جن افراد کے نام لیے گئے ہیں ان میں سے تمام نہ کاتبان وحی تھے اور نہ ان میں ہر ایک کے پاس اپنا الگ الگ نسخہ موجود تھا۔
4. اگر یہ حروف مختلف نسخوں کے مالکوں کے ناموں کامخفف ہیں تو پھر انھیں بسم اللہ کے بعد نہیں اس سے پہلے آنا چاہیے تھا۔(7)

دیگر نظریات

حروف مقطعات کے بارے میں بعض دیگر نظریات بھی پیش کیے گئے ہیں جن کی اپنے مقام پر اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اختصار کے پیش نظر ہم چند ایک کا مختصر تعارف کروانے پر اکتفاء کرتے ہیں۔

18) یہ حروف بندوں کے امتحان کے لیے ہیں

ان کے معانی فقط خدا کو معلوم ہیں اس نے بندوں کے امتحان کے لیے انھیں نازل کیا کہ کون بلاچون وچرا ان کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔اس نظریے کے مطابق حروف مقطعہ متشابہات میں سے قرار اپائیں گے۔

19) یہ حروف نعمتوں اور ابتلاؤں وغیرہ کی طرف اشارہ ہیں

یہ حروف اللہ تعالیٰ کی نعمتوں، ابتلاؤں اور قوموں کی زندگی اور موت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

20)　ہر سورۃ کے شروع میں آنے والے حروف مقطعہ اس سورۃ میں زیادہ استعمال ہوئے ہیں

کسی سورت کے شروع میں آنے والے حروف مقطعہ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ حروف اس سورت میں زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً سورہ ''ص'' میں حرف ''ص'' کے استعمال کا تناسب دوسری سورتوں سے زیادہ ہے۔آیت اللہ مکارم شیرازی نے تفسیر نمونہ کی پہلی جلد میں خلیفہ رشاد کی کوششوں کے نتائج کے طور پر اس نظریے کو پیش کیا ہے دیگر کئی ایک مفسرین اور دانشوروں نے اس نظریے کو ذکر کیا ہے۔اس پر خاصی تنقید بھی کی گئی ہے۔

21)　حروف مقطعہ متعلقہ سورۃ سے خصوصی مناسبت رکھتے ہیں

حروف مقطعہ جس سورت کے شروع میں آئے ہیں وہ اس سورہ کے مضمون سے خصوصی مناسبت رکھتے ہیں۔

مختلف اقوال میں تطبیق

بعض علماء نے حروف مقطعہ کے بارے میں مختلف اقوال میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ بعض اقوال ایسے ہیں کہ جو ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہیں اور ایک ہی وقت میں مختلف حروف مقطعہ ایک سے زیادہ معانی اور مقاصد کے حامل ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں قدماء میں اہم نام محمد بن جریر الطبری کا ہے۔ انھوں نے اپنی تفسیر جامع البیان عن تاویل آی القرآن میں اس نظریے کو درست قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''والصواب من القول عندی فی تأویل مفاتح السور الی ھی حروف المعجم أن اللہ جل ثناؤہ، جعلھا حروفا مقطعة ولم یصل بعضھا ببعض فیجعلھا کسائر الکلام المتصل الحروف، لأنه عزذکرہ أراد بلفظه الدلالة بکل حرف منه علی معان کثیرة لا علی معنی واحد، کما قال الربیع بن أنس۔۔۔''

یعنی: ''میرے نزدیک سورتوں کے شروع میں آنے والے حروف معجم کی تاویل میں صحیح قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حروف مقطعہ قرار دیا ہے اور یہ ایک دوسرے سے وصل نہیں ہوتے پس اللہ نے انھیں دیگر دوسرے کلام کی طرح قرار دیا ہے جو متصل حروف پر مشتمل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر لفظ کو بہت سے معنی پر دلالت قرار دیا ہے نہ کہ کسی ایک معنی پر جیسے کہ ربیع بن انس کا قول ہے۔۔۔''

یہ بات کہنے کے بعد علامہ محمد بن جریر الطبری اس نظریے پر ہونے والے ممکنہ اعتراض کا جواب دیتے ہیں:

"فان قال لنا قائل: و کیف یحوز۔۔۔۔ کل حرف منها دال علی معان شی،۔۔۔" (8)

یعنی: "پس اگر ہمیں کوئی یہ کہے کہ کیسے جائز ہے کہ ایک حرف بہت سے مختلف معانی پر دلالت کرتا ہو تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ جیسے ایک کلمہ کے لیے جائز ہے کہ وہ بہت سے مختلف معانی کا حامل ہو جیسے انسانوں کے ایک گروہ کے لیے کلمہ استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح وقت کے ایک دورانیے کے لیے بھی امت کا لفظ استعمال ہوتا ہے، اللہ کی اطاعت کرنے والے اور فرمانبردار مرد کے لیے بھی امت کا لفظ بولا جاتا ہے اور دین و ملت کے لیے بھی امت کا کلمہ بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اسی طرح جزا اور قصاص کے لیے دین کا لفظ استعمال ہوتا ہے، سلطان اور اطاعت کے لیے بھی دین کا کلمہ بروئے کار لایا جاتا ہے۔ تذلل اور حساب کے لیے بھی دین کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ایسی ہم بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں جن سے کتاب طویل ہو جائے گی۔ پس جیسے کلام میں لفظ واحد کثیر معانی پر مشتمل ہو سکتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قول (الم، والمر، والمص) وغیرہ بھی جو حروف مقطعہ کے طور پر سورتوں کے شروع میں آیا ہے، ان میں سے ہر حرف متعدد معانی پر دلالت کر سکتا ہے۔۔۔"

ابن کثیر نے ابن جریر طبری کے اس نظریے کی مخالفت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"فان أبا العالیة زعم۔۔۔۔ هذا موضع البحث فیها والله أعلم۔" (9)

یعنی: "ابوالعالیہ کا زعم یہ ہے کہ یہ حرف ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ معنی پر دلالت کرتے ہیں جب کہ لفظ امت اور اس سے ملتے جلتے دیگر الفاظ جنھیں اصطلاح میں الفاظ مشترکہ کہا جاتا ہے وہ قرآن میں ہر موقع پر کسی ایک معنی پر دلالت کرتے ہیں جو سیاق کلام سے سمجھ میں آتا ہے۔ ایک ہی جگہ پر سب کے سب معنی مراد نہیں ہوتے اور تمام معنی کو ایک جگہ پر محمول کرنے کے مسئلے میں علمائے اصول کا اختلاف ہے اور یہ موقع اس پر بحث کا نہیں ہے واللہ اعلم۔"

ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن حکیم کے مختلف بطون کے حامل ہونے کی روایات اس موقع پر ہماری مدد کرتی ہیں۔ بعید نہیں ہے کہ مختلف روایات جو آپس میں ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتیں اور جو حروف مقطعہ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں انہی مختلف بطون کی طرف اشارہ کرتی ہوں۔ قرآن حکیم کے مختلف مراتب کے حامل ہونے کا نظریہ بھی اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اگر اس ضمن میں شیعہ و سنی کتب احادیث میں بہت سی

معتبر روایات نہ ہوتیں پھر بھی ابن جریر کے نظریے سے صرف نظر کیا جاسکتا تھا چنانچہ استاد جوادی آملی نے بھی روایات ہی کی بحث کے ضمن میں اس نظریے کو اپنے دلائل کی روشنی میں بیان کیا ہے۔

علامہ جوادی آملی نے حروف مقطعہ کے بارے میں احادیث و روایات کے مابین جمع و تطبیق کا راستہ اختیار کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک ایک ہی وقت میں مختلف حروف مقطعہ ایک سے زیادہ معانی کا امکان رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"روایات تفسیری معتبر، ۔۔۔۔ نه بر تعدد مفاهیم۔" (10)

معتبر تفسیری روایات حروف مقطعہ کے بارے میں طرح طرح کے معنی بیان کرتی ہیں۔ یہ روایات چونکہ مشتبہات کی قسم سے ہیں اس لحاظ سے اس معنی میں کہ ہر کوئی کسی ایک امر کا اثبات کرتی ہے اور کوئی بھی کسی دوسری روایت کے مفاد معنی کی نفی نہیں کرتی اس لیے ان کے مطابق قابل جمع ہیں اور ممکن ہے کہ وہ سب درست ہوں۔ اس لیے تخصیص، تقیید یا تصحیح کی ضرورت نہیں مثلا "الم" کی تفسیر میں اگر روایات میں مختلف بیانات آئے ہیں مثلاً یہ کہ بعض روایات ان میں سے ہر حرف کو اسمائے الٰہی میں سے کسی ایک اسم کی طرف ناظر سمجھتی ہیں (مثلاً الف کو اللہ، لام کو علیم اور میم کو حکیم یا ملک کے لیے اشارہ قرار دیتی ہیں) اور بعض روایات ان تینوں حروف کو اسم اعظم کا ایک حصہ قرار دیتی ہیں جب کہ بعض دیگر روایات انھیں امتوں کی عمر کی طرف اشارہ قرار دیتی ہیں اور بعض دیگر روایات انھیں تحدی کے مفہوم میں لیتی ہیں اسی طرح بعض دیگر مطالب پر دلالت کرنے والی روایات ہیں۔

کوئی ایسی دلیل نہیں کہ جو اجمالی طور پر ان روایات کے بطلان پر دلالت کرتی ہو کیونکہ یہ ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتیں کہ ہم یہ کہیں کہ یہ ایک دوسرے کی متناقض ہیں جس کی بنا پر اس میں کسی ایک کے ہونے کا یقین ہو سکے بلکہ ممکن ہے مطلوب کے تعدد یا متعدد ہونے کی وجہ سے یہ حروف مقطعہ کے معانی کے مختلف مراتب کی طرف اشارہ کرتی ہوں اور اس لحاظ سے یہ سب درست ہوں۔ اس لیے حروف مقطعہ کی تفسیری روایات کی تحقیق کے حوالے سے کہنا چاہیے: ضعیف روایات اور اسرائیلیات کی شناخت کے بعد اور ان سے صرف نظر کرنے کے بعد دیگر روایات قابل قبول ہیں اور انھیں مختلف مراتب اور مختلف مصادیق پر محمول کرنا چاہیے نہ کہ مفاہیم کے تعدد پر۔

تعدد مصادیق و مراتب کے حوالے سے استاد جوادی آملی کی بات دراصل ملا صدرا کے نظریہ تشکیک کی طرف متوجہ کرتی ہے جو قرآن حکیم کے بارے میں بھی مختلف مراتب کے قائل ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں :

"چون حقیقت قرآن واحد است و مراتب زیادی دارد، پس، هر کسی از این حقیقت تشکیکی بهره ای خاص می برد، زیرا! شرایط خاصی مانند ایمان، ارتباط با اهل بیت علیهم السلام و طهارت را می طلبد و هریك از این اوصاف، دارای مراتبی می باشد و هر کس، مرتبه ای از آن ها را دارا می باشد" (11)

حروف مقطعہ بامعنی ہیں تو مابعد کے ساتھ بامعنی تعلق

جیسا کہ مختلف تفاسیر اور اقوال علماء سے ظاہر ہوتا ہے کہ علمائے اسلام کی بھاری اکثریت اس نظریے کی حامل ہے کہ حروف مقطعہ بامعنی ہیں خود ناچیز کی بھی یہی رائے ہے لیکن یہ رائے اختیار کرنے کے بعد یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ حروف مقطعہ بامعنی ہیں تو ان کے بعد آنے والی عبارت یا مطالب کے ساتھ ان کا بامعنی تعلق بھی ضروری ہے۔ حروف مقطعہ کی حقیقت جاننے کے حوالے سے علمائے کرام کی تمام تر کوششیں اسی تعلق کو جاننے پر مرکوز رہی ہیں۔ یہ رائے اختیار کرکے وہ فطری طور پر اس تعلق کو جاننے پر مجبور ہیں۔

حروف مقطعہ کے حوالے سے بعض آراء ایسی ہیں کہ جنھیں اختیار کرنے کے بعد اس تعلق کے بارے میں رائے قائم کرنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے اور بعض آراء یقینی طور پر دقت طلب ہیں یا پھر ان کے نتیجے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔ مثال کے طور پر سر سید احمد خاں کے نظریے مطابق حروف مقطعہ اُن سورتوں کے نام ہیں جن کے آغاز میں یہ آئے ہیں اور بعض سورتوں کے مشترک حروف مقطعہ ان سورتوں کا مشترک نام ہیں اگرچہ ان کے اس نظریے کی کوئی یقین آور دلیل نہیں اور اس کی حیثیت ایک قول کی ہے تاہم نام قرار پانے کے بعد صرف ان حروف مقطعہ کو بطور نام اختیار کرنے کی کوئی وجہ یا حکمت بھی ہے یا نہیں، صرف یہ پہلو سوال انگیز رہ جاتا ہے۔

دوسری قسم کے لیے علامہ فراہی کے نظریے کو بطور مثال ذکر کیا جاسکتا ہے جن کے نزدیک حروف اشیاء، ہیئات یا معانی پر دلالت کرتے ہیں اگرچہ حروف کے معانی کا علم مٹ چکا ہے۔ وہ چند ایک مثالوں کے علاوہ خود بھی زیادہ بات نہیں کر سکتے۔ یہ نظریہ اختیار کرنا بہت دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔ خاص

طور پر علماء کے اُس گروہ کے لیے جو جاہلی ادب کو قرآن فہمی کی بنیاد بناتا ہو اور اپنے اس نظریے کے اثبات کے لیے خود بھی بند گلی میں جا پہنچا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دور نزول قرآن ہی میں بعض حروف معانی پر دلالت کرتے تھے اور اس کی مثالیں دیگر زبانوں میں بھی موجود ہیں، اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بعض زبانوں کے حروف اشکال وغیرہ پر مبنی ہیں لیکن نزول قرآن کے زمانے میں عربی زبان کے تمام تر حروف خاص معانی پر دلالت کرتے تھے، یہ بات نا قابل اثبات ہے۔

فہم قرآن کی شرائط

ویسے تو بہت سے علماء نے فہم قرآن کے مقدمات اور شرائط کا ذکر کیا ہے تاہم ملا صدرا شیرازی اپنے فلسفہ تشکیک کی روشنی میں حروف مقطعہ کی تفسیر یا حقیقت بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حقیقت قرآن ایک ہی ہے البتہ اس کے بہت سے مراتب ہیں لہٰذا ہر کوئی اس تشکیکی (ذوالمراتب) حقیقت سے کچھ حصہ پالیتا ہے۔ ان کے نزدیک فہم قرآن کے لیے ایمان، ارتباط با اہل بیت علیہم السلام اور طہارت جیسی خاص شرائط درکار ہیں اور ان اوصاف میں سے ہر وصف کے اپنے مراتب ہیں اور ہر شخص ان میں سے کسی خاص مرتبے کا حامل ہے۔ اپنے اسی مرتبے کے لحاظ سے اسے فہم قرآن حاصل ہے۔

ملا صدرا کے اپنے الفاظ میں:

”چون حقیقت قرآن واحد است و مراتب زیادی دارد، پس، هر کسی از این حقیقت تشکیکی بهره ای خاص می برد، زیرا! شرایط خاصی مانند ایمان، ارتباط با اهل بیت علیهم السلام و طهارت را می طلبد و هریك از این اوصاف، دارای مراتبی می باشد و هر کس، مرتبه ای از آن ها را دارا می باشد“ (12)

ملا صدرا کے نزدیک اس کے مختلف تشکیکی مراتب ہیں اور سیر نزولی میں اس کے بہت سے مراتب و مقامات ہیں اور ہر کوئی قرآن کے کسی خاص مرتبے سے ارتباط رکھتا ہے۔ ملا صدرا کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے ان کی ”برہان صدیقین“ کو نظر میں رکھنا ضروری ہے جو چار اہم فلسفیانہ اصولوں پر استوار ہے جو اصالت وجود، تشکیک وجود، بساطت وجود اور امکان فقری سے عبارت ہیں۔ ان میں سے تشکیک وجود کی حقیقت کے بارے میں ڈاکٹر سید ناصر زیدی لکھتے ہیں:

تشکیک وجود سے مراد یہ ہے کہ وجود کے افراد میں ذاتی اختلاف نہیں ہے بلکہ کمال و نقص اور شدت وضعف کے اعتبار سے اختلاف ہے (جیسے روشنی کے مراتب)۔ دوسرے الفاظ میں مابہ الامتیاز، بعینہ مابہ الاختلاف بھی ہے اور دونوں کی برگشت وجود کی طرف ہی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے کامل ترین مرتبہ، غیر سے وابستہ نہیں ہے۔(13)

گویا ہر ایک نے اپنے درجہ فہم اور اپنے روحانی مرتبے کے مطابق قرآن حکیم سے بحیثیت کلی اور حروف مقطعہ سے بطور خصوصی کسب فیض کیا ہے۔ اس کے لیے سطور بالا میں ملا صدرا کی بیان کردہ جن تین شرائط کا ذکر آیا ہے وہ قرآن حکیم ہی سے ماخوذ ہیں۔

۱۔ اس سلسلے میں پہلی شرط ایمان قرار دی گئی ہے۔ سورہ بقرہ کے ابتدا ہی میں اس مسئلے کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"الٓمّٓ O ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَO الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ۔۔۔"

۲۔ دوسری شرط ارتباط با اہل بیتؑ بیان کی گئی ہے۔ مختلف روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ اہل بیتؑ رسالت ہی راسخون فی العلم ہیں (14) علامہ بحرینی نے اصول کافی سے امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث نقل کی ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے:

نحن الراسخون فی العلم۔۔۔ (ہم ہیں راسخون فی العلم)

حضرت علیؑ کو باب مدینۃ العلم (15) اور باب دار الحکمت (16) قرار دیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ جیسے انھو ں نے تنزیل قرآن پر میرے ہمراہ جنگ کی ہے اسی طرح وہ تاویل قرآن پر جنگ کریں گے۔(17) اسی طرح عترت اہل بیتؑ کو قرآن حکیم کا مثیل اور دائمی ساتھی (18) بھی فرمایا گیا ہے۔ حضرت علیؑ کے بارے میں بھی ارشاد رسالت مآبؐ ہے کہ قرآن علیؑ کے ساتھ ہے اور علیؑ قرآن کے ساتھ ہے۔(19) ایسی تمام روایات کو پیش نظر رکھ کر یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ ملا صدرا نے قرآن فہمی کے لیے ارتباط با اہل بیتؑ کی شرط کیوں رکھی ہے۔

۳۔ ملا صدرا نے قرآن فہمی کے لیے تیسری شرط قرآن کو قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں اس آیہ مجیدہ کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے:

"لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ" (20)

اس (قرآن کریم) کو پاک کیے گئے افراد کے سوا کوئی چھو بھی نہیں سکتا۔

اس میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ پاک کیے گئے افراد کا اعلیٰ ترین مصداق اصحاب کساء اور اہل بیت اطہارؑ ہیں جن کی طہارت کا ذکر سورۂ احزاب کی مشہور آیت تطہیر میں کیا گیا ہے۔

نکات آخر

☆ اکثر نظریات اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ حروف مقطعات محققات (abbreviations) ہیں۔ ان تمام نظریات کے مطابق قرآن حکیم میں یہ حروف با معنی ہیں۔

☆ وہ تفاسیر جو ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتیں یا باہم متضاد نہیں ہیں سب درست ہو سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف تفاسیر یا معانی کی طرف اشارہ کرنے والی احادیث کو شاہد قرار دیا جاسکتا ہے۔ قرآن حکیم کا مختلف مراتب یا بطون کے حامل ہونے کا نظریہ بھی اسی امر کی تائید کرتا ہے۔

☆ کسی بھی تفسیر کا نظریہ ایک احتمال سے زیادہ نہیں۔ آخر کار یہی بات سب سے زیادہ برحق ہے کہ حروف مقطعات محب و محبوب کے درمیان رمز اور سّر ہیں اگرچہ قاریان قرآن کو چاہیے کہ ان پر غور و فکر جاری رکھیں۔ ایمان کے ساتھ غور و فکر کے حیران کن مثبت نتائج برآمد ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ طالبانِ صادق کو محروم نہیں رکھتا۔

*****

حوالہ جات

1۔ حسن الدین احمد، ڈاکٹر: احسن البیان فی علوم القرآن (لاہور، مکتبہ تعمیر انسانیت، ۱۹۹۴ء) ص ۲۵۰

2 ۔ ملا صدرا: الحکمۃ المتعالیہ فی الاسفار العقلیۃ الاربعۃ، قم، المطبعۃ العلمیۃ، ج ۷، ص ۴۲

3۔ ملا صدرا: تفسیر القرآن الکریم، ج ۶، ص ۱۹

4 ۔ ۱۱۳۔ علق: ۲

5۔ ۵۴۔ قمر: ۲۲

6 ۔www.noormags.ir/articlepage/3758/174

7 ۔جوادی آملی، تسنیم، تفسیر قرآن کریم (قم، مرکز نشر اسراء، ۱۳۷۸ھ ش، ط اول) ج ۲، ص ۹۶ و ۹۷

8۔طبری، ابی جعفر محمد بن جریر (م ۳۱۰ھ): جامع البیان عن تاویل آی القرآن (لبنان، بیروت، دار الفکر، ۱۹۸۸ء) ج ۱، ص ۹۳ و ۹۴

9 ۔ابن کثیر دمشقی: تفسیر القرآن العظیم (بیروت، دار الکتب العلمیہ، منشورات محمد علی بیدون ۱۹۹۸ء) ج ۱، ص ۶۸

10۔جوادی آملی، تسنیم، تفسیر قرآن کریم (قم، مرکز نشر اسراء، ۱۳۷۸ھ ش، ط اول) ج ۲، ص ۱۲۷

11۔صدر المتالھین شیرازی، محمد بن ابراہیم، تفسیر القرآن کریم، تصحیح محمد خواجوی، ق، انتشارات بیدار، سال ۱۳۶۶ھ ش، جلد ۱، ص ۲۰۹

12 ۔صدر المتالھین شیرازی، محمد بن ابراہیم، تفسیر القرآن کریم، تصحیح محمد خواجوی، ق، انتشارات بیدار، سال ۱۳۶۶ھ ش، جلد ۱، ص ۲۰۹

13 ۔زیدی، ڈاکٹر سید ناصر: دلائل وجود باری تعالیٰ ملا صدرا کی نظر میں (اسلام آباد، البصیرہ، دسمبر ۲۰۰۶) ص ۹۷

14 ۔بحرینی، سید ہاشم، البرہان فی تفسیر القرآن (تہران، دار البعثۃ، ۱۹۹۵ء) ج ۴، ص ۹۳) یہی حدیث تفسیر العیاشی وغیرہ میں بھی نقل کی گئی ہے۔

15۔نیشاپوری، الحاکم، ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ (م ۴۰۵ھ) المستدرک علی الصحیحین، تحقیق مصطفیٰ عبدالقادر عطا، (بیروت، دار الکتب العلمیہ، ط اول، ۱۹۹۰ء) ج ۳، ص ۱۳۷ و ۱۳۸

16 ۔ الشیبانی، ابو عبداللہ احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) فضائل صحابہ، تحقیق وصی اللہ محمد عباس (بیروت، موسسہ الرسالۃ، ط اول، ۱۹۸۳ء) ج ۲، ص ۶۳۴

17 ۔بحار الانوار، ج ۳۲، باب ۷، روایت ۲۶۰

18 ۔کافی ج ۱، کتاب الحجۃ باب الاشارۃ والنص علی امیر المومنین، ص ۲۹۴، ح ۱، و مسند احمد، ج ۳، ص ۱۴، و سنن ترمذی، ج ۵، باب مناقب اہل بیت النبی، ص ۳۲۹، حدیث ۳۸۷۶

19۔نیشاپوری، الحاکم، ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ (م ۴۰۵ھ) المستدرک علی الصحیحین، تحقیق مصطفیٰ عبدالقادر عطا، (بیروت، دار الکتب العلمیہ، ط اول، ۱۹۹۰ء) ج ۳، ص ۱۳۴

20 ۔۵۶۔واقعہ: ۷۹

اسلام کی تبلیغ میں حضرت خدیجہؓ کا کردار

ڈاکٹر انصارالدین مدنی*

محمد ریاض ،فضہ مسلم*

riaz.razee@yahoo.com

کلیدی کلمات: حضرت خدیجہ، اُمّ المومنین، اسلام، تبلیغ، دعوت ذوالعشیرہ، شعب ابی طالب، ہجرت حبشہ۔

خلاصہ

اسلام کی تبلیغ اور نشرواشاعت میں "اُمّ المؤمنین" حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) کا کردار بے مثال ہے جسے بدقسمتی سے کماحقہ اجاگر نہیں کیا گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کی ذات میں حق پرستی نہفتہ تھی جس کی بدولت آپ نے شریک حیات کے طور پر ﷺ کا انتخاب کیا۔ آپ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آنحضرتؐ نے سب سے پہلے آپ کو اپنی الٰہی رسالت سے آگاہ فرمایا اور آپ نے فوراً نبوت کی تصدیق کی اور آپؐ کے ساتھ نماز ادا کی۔

آپ کا زندگی گزارنے کا سلیقہ آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ سے مطابقت رکھتا تھا۔ اسلام کی نشرواشاعت میں آپ کا مال و دولت کام آیا۔ آپ کی دولت غلاموں اور کنیزوں کی آزادی، شعب ابی طالب کے بے نواؤں، حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والوں اور مکہ کے غریبوں اور یتیموں پر خرچ ہوئی۔ زیر نظر مقالہ میں اسلام کی تبلیغ میں آپ کے کردار کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

*۔ لیکچرار قراقرم انٹر نیشنل یونیورسٹی، گلگت۔

*۔ ریسرچ اسکالرز، شعبہ علومِ اسلامی، جامعہ کراچی۔

مقدمہ

اسلام کی تبلیغ اور نشرواشاعت میں حضرت ابوطالبؑ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) کا ایک بے مثال کردار ہے۔ بد قسمتی سے عالمِ اسلام میں ان دونوں شخصیات کی خدمات کو کماحقہ اجاگر نہیں کیا گیا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اسلام کی تبلیغ میں ان ہستیوں کے کردار کو اجاگر کیا جائے، تاکہ جہاں ان کا حق ادا کیا جاسکے، وہاں ان کی سیرت و کردار کو نمونہ عمل بھی بنایا جاسکے۔ زیر نظر مقالہ میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) کی بے نظیر خدمات اور تبلیغ اسلام میں ان کے کردار کو اجاگر کیا گیا ہے۔

اسلام کی مخفی تبلیغ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) کا کردار

پیغمبر اکرم ﷺ کے ساتھ عقد کے بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) نے اپنی پوری دولت آنحضرت ﷺ کے سپرد کردی جو نہ فقط ان کی زندگی میں اسلام کی تبلیغ پر خرچ ہوئی، بلکہ آپ کی وفات کے بعد بھی اسلام کی تبلیغ میں استعمال ہوتی رہی۔ بعثت کے بعد تین سال تک اسلام کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ مخفی رہا۔ یقینا اس دوران آنحضرت ﷺ نے اپنی تجارتی سرگرمیوں کو روکا ہوا تھا۔ کیونکہ بعثت سے قبل آپؐ غار حرا میں مشغول عبادت رہتے۔ جب وحی کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو آپؐ اس کے بعد تجارتی سرگرمیوں اور کسب معاش کی حالت میں نہ تھے۔

تاہم سوال یہ ہے کہ اس دوران آپؐ کے گھریلوے اخراجات، غلاموں اور اہل خاندان کا خرچ، نیز معاشرے میں موجود یتیموں، مسکینوں، بیواؤں اور بے کسوں پر مالی ایثار کا خرچ کہاں سے پورا ہوتا تھا؟ یہاں تک کہ آنحضرتؐ غار حرا میں دوران عبادت بھی بھوکوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ ابن ہشام، ابن اسحاق کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> ”عبداللہ بن زبیر نے عبید بن عمیر بن قتادہ لیثی سے کہا: اے عبید! ہم بتایئے کہ کیسے جبرئیل آپؐ کے پاس تشریف لائے اور حضورؐ پر وحی کی ابتداء کیسے ہوئی؟ راوی کہتے ہیں کہ جب عبید نے یہ واقعہ عبداللہ بن زبیر اور لوگوں کے سامنے نقل کیا تو میں اس وقت موجود تھا۔ انہوں نے کہا کہ: حضورؐ ہر سال میں ایک مہینہ غار حرا کے اندر خلوت کے لئے تشریف لے جاتے تھے اور جو مسکین آپؐ کے پاس آتا اس کو کھانا کھلاتے تھے“۔(1)

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ آنحضرتؐ اعلان نبوت سے پہلے اکثر غار حرا میں جایا کرتے تھے اس دوران سائل آکر سوال کرتے تھے اور آپؐ ان کی مدد کرتے تھے۔ آنحضرتؐ یتیموں سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ تبھی تو آنحضرتؐ غار حرا میں مراقبہ کے دوران بھی یتیموں کو مایوس نہیں کرتے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب آپؐ کا کوئی کسب معاش نہ تھا، وہ مال و دلت جو آپؐ غریبوں اور یتیموں پر خرچ کرتے تھے، کہاں سے آتا تھا؟ یقینا یہ حضرت خدیجۃالکبریٰ(س) کی دولت کا ایک حصہ تھا جو اس قسم کے کاموں کے لیے مخصوص تھا۔ اسی طرح دعوت ذوالعشیرہ میں تین دن تک کھانا کھلانے کی واقعہ جو کہ تاریخ اسلام کے مسلمہ واقعات میں سے ہے۔ علامہ حلبی نے اس واقعہ کی تفصیل کچھ یوں بیان کی ہے:

"جب آپؐ پر وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (2) کی آیت نازل ہوئی تو آپؐ نے ابوطالبؑ کے مکان میں عبدالمطلب کی اولاد کو جمع کیا جن کی تعداد چالیس تھی۔ کتاب امتاع میں ہے کہ کل پینتالیس مرد اور دو عورتیں تھیں۔ غرض حضرت علیؑ نے ان آنے والوں کے لیے کھانا تیار کیا۔ اس میں بکری کی ایک ٹانگ تھی جس کے ساتھ ایک مدّ یعنی تقریبا سوا رطل گیہوں اور ساڑھے تین سیر دودھ تھا۔ چنانچہ ایک بڑے برتن میں کھانا لا کر ان لوگوں کے سامنے رکھ دیا گیا اور آپؐ نے ان سے فرمایا۔ اللہ کا نام لے کر کھانا کھایئے۔۔۔ لیکن جب آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں سے بات چیت کا ارادہ فرمایا تو ابولہب نے آپؐ کی بات کاٹ کر کہا: "اس شخص نے تم سب پر زبردست جادو کر دیا ہے۔" یا یہ کہا کہ: " ہم نے آج تک ایسا جادو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سب لوگ اٹھ کر چلے گئے اور آنحضرت ﷺ ان سے کوئی بات نہیں کر سکے۔ اگلا دن ہوا تو آپؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا۔ جس طرح تم نے کل کھانا اور مشروب تیار کیا تھا اسی طرح میری طرف سے آج پھر وہی چیزیں تیار کر دو۔۔۔ چنانچہ حضرت علیؑ کہتے ہیں کہ میں نے کھانا تیار کیا۔۔۔(3)

دعوت ذوالعشیرہ کے واقعہ کے ضمن میں حلبی اور دوسرے سیرت نگاروں نے اس دعوت کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس دعوت کے انعقاد میں حضرت خدیجہ کی دولت اسلام کی تبلیغ پر خرچ ہوئی۔ اور یہ کہنا بجا ہوگا کہ نہ تنہا اس دعوت پر حضرت خدیجہ کا مال خرچ ہوا بلکہ آنحضرتؐ نے جو طریقہ اسلام کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں اپنایا ہوا تھا اس کا ایک انداز یہی تھا کہ آپؐ اس قسم کی ضیافتوں کا اہتمام

کیا کرتے تھے۔ آنحضرتؐ انہیں دعوت ضیافت دے کر اس بات کا پابند بنا دیتے کہ وہ آپؐ کی بات سنیں۔ علامہ حلبی کی ایک اور روایت اس سلسلے میں یہ ملتی ہے:

"حضرت علیؑ نے بیان کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کو کھانا تیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کھانا پکایا۔ اس کے بعد آپؐ نے مجھ سے فرمایا۔ بنی عبدالمطلب کو میری طرف سے دعوت دے کر بلالاؤ۔ چنانچہ میں نے چالیس آدمیوں کو دعوت دی۔ اب ان دونوں روایتوں کی موجودگی میں کہ آیا کھانا حضرت علیؑ نے پکایا تھا یا حضرت خدیجہؓ نے۔ اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ ممکن ہے یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا ہو۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت علیؑ نے کھانا تیار کرنے کا کام حضرت خدیجہ (س) کے یہاں کیا ہو اور اور پھر لوگوں کو بلا کر ابوطالب کے مکان میں لائے ہوں۔ (4)

مذکورہ دونوں عبارتیں اس بات کی شاہد ہیں کہ آنحضرتؐ اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنے سے پہلے دعوت ضیافت کا اہتمام فرماتے تھے۔ ایسی دعوتوں کو سیرت نگار اگرچہ معجزات نبویؐ میں شامل کرکے خرچ ہونے والے سرمایہ کو کم سے کم ثابت کرنا چاہتے ہیں مگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے پاس حضرت خدیجۃ الکبریٰ (س) کی دولت کی شکل میں کثیر سرمایہ موجود تھا۔ اس لیے اس قسم کی ضیافتوں کا اہتمام کرنے میں آپؐ کو کوئی پریشانی لاحق نہ ہوتی تھی۔

اس کے علاہ سیرت کی کتابوں میں یہ بھی ملتا ہے کہ آنحضرتؐ موسم حج کے دوران حاجیوں کے پاس جاتے تھے اور انہیں اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ ظاہر ہے آپ اسلام کی دعوت کھڑے کھڑے نہیں دے سکتے تھے۔ اور آنحضرتؐ کی سیرت میں یہ بات شامل تھی کہ آپؐ مہمانوں اور مسافروں کا نہایت خیال رکھتے تھے۔ اس اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آنحضرتؐ ایسے لوگوں کو نہ صرف اسلامی تعلیمات سے آگاہ فرماتے تھے بلکہ ان کی میزبانی بھی کرتے تھے۔ اور اس قسم کی میزبانیوں پر خرچ ہونے والا سرمایہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ (س) کے مال و دولت سے مہیا ہوتا تھا۔

غلاموں اور کنیزوں کی آزادی:

بعثت کے بعد آپؐ نے خفیہ دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ ابتدائی طور پر جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان میں اکثریت غلاموں اور غریبوں پر مشتمل تھی۔ آنحضرتؐ یہ کوشش رہتی تھی کہ مسلمان، غلاموں کو خرید کر آزاد کریں تاکہ وہ اپنے آقاؤں کے ظلم و ستم سے نجات پا سکیں۔ آپؐ صاحب حیثیت صحابہ

کرام رض کو بھی اس پر آمادہ فرماتے تھے کہ وہ غلام و کنیز خرید کر آزاد کریں۔ آنحضرتؐ نے وقتاً فوقتاً جو غلام اور کنیزیں آزاد فرمائیں، علامہ طبری نے ایسے سترہ غلاموں کا تذکرہ کیا ہے جن میں زید بن حارثہ، ثوبان، شقران، ابورافع، سلمان الفارسی، سفینہ، انستہ ابومسرح، ابوکبشہ، ابومویہبہ، رباح الاسود، فضالہ، مدعم، ابوضمیرہ، یسار، مہران، مابور اور ابوبکرہ وغیرہ شامل ہیں۔ (5) بلکہ علامہ طبری کی عبارات سے آنحضرتؐ کی طرف سے کل بائیس آزادہ کردہ غلاموں کا تصور ملتا ہے۔

علامہ حلبی نے بھی سیرت حلبیہ میں آنحضرتؐ کے آزاد کردہ آٹھ مشہور غلاموں کا مختصر تعارف پیش کیا ہے جن میں زید بن حارثہ، ابورافع، شقران، انجشہ، رباح، یسار، سفینہ اور مامور شامل ہیں۔ یہاں علامہ حلبی نے سلمان فارسی کے متعلق یہ وضاحت کی ہے۔ حضرت سلمان فارسی کو "آپ ﷺ کا آزاد کردہ غلام اس لیے کہا گیا کہ آپ ﷺ نے ان کی طرف سے ان کی آزادی کی قیمت ادا فرمائی تھی"۔ (6)

اس کے علاوہ علامہ حلبی یہ بھی لکھتے ہیں "مورخین لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے مرض وفات میں چالیس غلام آزاد فرمائے۔ عورتوں میں جن کنیزوں کو آپ ﷺ نے آزاد فرمایا ان میں ام ایمن، امیمہ اور سیرین شامل ہیں"۔ (7) ابن کثیر کے ہاں آنحضرتؐ کے آزاد کردہ غلاموں اور کنیزوں کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان میں اڑتیس ۳۸ غلام اور بیس ۲۰ کنیزیں شامل ہیں۔ (8)

خلاصہ یہ کہ سیرت نگاروں نے آنحضرتؐ کے آزاد کردہ جن غلاموں اور کنیزوں کا مختصر تعارف پیش کیا ہے، ان کی تعداد بیس، باون اور اٹھاون تک جا بنتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی طبیعت میں یہ بات شامل تھی کہ آپؐ غلاموں کو آزادی دلا کر سکون محسوس کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مکی زندگی میں بھی آپؐ غلاموں کو آزادی دلا کر سکون محسوس کرتے رہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ غلاموں کو آزاد کرنے کا سرمایہ آپؐ کہاں سے اخذ فرماتے تھے؟ یقیناً آپؐ کے پاس یہ سرمایہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؑ کے دیئے ہوئے مال و دولت کی صورت میں موجود تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؑ نہ فقط اپنی دولت آنحضرتؐ کے اختیار میں دے کر انسدادِ غلامی مہم میں آپؐ کے شانہ بشانہ رہیں، بلکہ غلاموں کی آزاد سے مربوط اسلامی احکام نازل ہونے سے بہت پہلے انہوں نے خود کئی غلام اور کنیزیں آزاد کیں۔

ہجرت حبشہ:

ہجرت حبشہ کے پس منظر کے حوالے سے علامہ شبلی نعمانی، ابن ہشام سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"محمد بن اسحاق مطلبی کہتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ نے ان تکلیفوں اور مصائب کو ملاحظہ فرمایا جو ان کے اصحاب پر کفار کی طرف سے نازل ہوتی تھی۔ اگرچہ خود حضورؐ حفاظت الٰہی اور آپ کے چچا ابوطالب کے سبب سے مشرکوں کی ایذاء رسانی سے محفوظ تھے مگر یہ ممکن نہ تھا کہ اپنے اصحاب کو بھی محفوظ رکھ سکتے۔ تو آپؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ اگر تم لوگ حبش چلے جاؤ تو بہتر ہے کیونکہ وہاں کا بادشاہ کسی پر ظلم نہیں کرتا اور وہ صدق وراستی کی سرزمین ہے؛ یہاں تک کہ خدا تمہارے واسطے کشادگی فرمائے اور جس سختی میں تم ہو اس کو دور کر دے۔ چنانچہ حضور ﷺ کے اس حکم کو سن کر بہت سے مسلمان اپنا دین محفوظ رکھنے کی خاطر حبشہ کی طرف روانہ ہوئے۔" (9)

مہاجرین کے حوالے سے علامہ شبلی نعمانی کا بیان ہے: "عام مؤرخین کا خیال ہے کہ ہجرت انہی لوگوں نے کی جن کا کوئی حامی اور مددگار نہ تھا۔"(10) لہٰذا ہجرت حبشہ کے مہاجرین کے بارے میں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے پاس سفری اخراجات کے لئے کوئی قابل سرمایہ نہ تھا اور وہ قابلِ رحم حیثیت رکھتے تھے۔ ابن ہشام کے مطابق سب سے پہلے دس لوگوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی جن میں حضرت عثمان بن عفان اور ان کی بیوی حضرت رقیہ، ابوحذیفہ اور ان کی بیوی سہلہ بنت سہیل، زبیر بن عوام، مصعب بن عمیر، عبدالرحمٰن بن عوف، ابوسلمہ بن عبدالاسد اور ان کی بیوی ام سلمہ بنت ابی امیہ وغیرہ شامل تھے۔ پھر حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے ہجرت کی اور پھر ان کے بعد بہت سے مسلمان حبش جانے لگے اور وہاں ان کی ایک کثیر تعداد جمع ہو گئی"۔(11)

ظاہر ہے ابن ہشام کے نزدیک مہاجرین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ تبھی تو انہوں نے اس مقام پر مہاجرین کی تعداد کا تعین کرنے کی بجائے "بہت سے" اور "کثیر تعداد جمع ہو گئی" کے جملے لکھے ہیں۔ لیکن آگے چل کر ابن ہشام تمام مہاجرین حبشہ کا نام اور قبیلہ کی تفصیل لکھ کر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ: "چنانچہ یہ سب لوگ جنہوں نے ملک حبش کی طرف ہجرت کی ہے علاوہ چھوٹے چھوٹے بچوں کے جو ان کے ساتھ تھے یا جو حبشہ میں پیدا ہوئے عمار بن یاسر سمیت تراسی آدمی ہیں۔ عمار بن یاسر میں شک ہے کہ انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی ہے یا نہیں"۔(12)

ابن کثیر ہجرت حبشہ کے متعلق یوں رقم طراز ہیں :

" واقدی کی روایت کے مطابق ان مسلمانوں نے مکے سے حبشہ کی طرف بعثت کے پانچویں سال رجب کے مہینے میں ہجرت کی اور جن لوگوں نے سب سے پہلے ہجرت کی ان میں گیارہ مرد اور چار عورتیں تھیں وہ لوگ ماش اور راکب کے درمیانی علاقے میں ساحل سمندر پر پہنچے اور وہاں سے حبشہ کے لیے نصف دینار پر کشتی کرایہ پرلی۔ ان پہلے ہجرت کرنے والوں کے نام یہ ہیں حضرت عثمانؓ بن عفان اور آپ کی اہلیہ رقیہ بنت رسول اللہؐ، ۔۔۔اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین۔ابن جریر اور بعد کے لوگوں نے ان کی تعداد بیاسی بتائی ہے جو عورتوں اور بچوں کے علاوہ ہے۔اگر عماربن یاسرؓ کو بھی ان میں شمار کیا جائے تو مردوں کی کل تعدادتراسی ہوتی ہے"۔(13)

خود ابن کثیر اپنی کتاب کے حاشیہ میں مہاجرین حبشہ کی تعداد کے بارے میں لکھتے ہیں:

" ان مہاجرین اور ان کی صحیح تعداد کے بارے میں مورخین میں اختلاف ہے، ہم نے متفق علیہ ناموں کے متعلق سیرت ابن ہشام کے علاوہ ابن اسحاق کے گنوائے ہوئے نام دوسری متعدد روایات سے مطابقت کے بعد یہاں درج کیے ہیں"۔(14)

علامہ طبری نے بھی مہاجرین حبشہ کی تعداد کا تعین نہیں کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

" ابو جعفر کہتا ہے اس پہلی ہجرت میں جو مسلمان ترک وطن کرکے حبشہ گئے تھے ان کی تعداد میں اختلاف ہے بعض راویوں نے کہا کہ یہ گیارہ مرد تھے اور چار عورتیں تھیں۔ حارث بن الفضیل سے مروی ہے اس پہلی ہجرت میں جن مسلمان مہاجرین نے خفیہ طور پر متفرق حالت میں ہجرت کی ان کی تعداد گیارہ مرد اور چار عورتیں تھی ان کے سوار اور پیدل شیعبہ آئے۔ اللہ نے ان کی یہ مدد کی کہ عین اسی ساعت میں دو تجارتی جہاز بندرگاہ پر آئے۔جو ان کو نصف دینار کرایہ میں حبشہ لے گئے"۔(15)

پیر محمد کرم شاہ لکھتے ہیں:

" چنانچہ بعثت کے پانچویں سال ماہ رجب میں مہاجرین کا پہلا قافلہ اپنے پیارے وطن کو چھوڑ کر حبشہ جیسے دورافتادہ ملک کی طرف روانہ ہوا۔ تاکہ اس پرامن فضامیں وہ جی

بھر کر اپنے رب کریم کی عبادت کر سکیں۔ اپنے عقیدہ کے مطابق آزادی سے زندگی بسر کر سکیں اور یہ قافلہ بارہ مردوں اور چار خواتین پر مشتمل تھا"۔ (16)

مہاجرین نے یہ سفر چونکہ بحری راستہ سے کیا تھا اس سفر میں کرایہ کی مد میں خرچ ہونے والے رقم کے متعلق پیر محمد کرم شاہ، احمد بن زینی دحلان کے حوالے سے یہ بھی لکھتے ہیں:

" یہ قافلہ رات کی تاریکی میں چھپ کر مکہ سے روانہ ہوا۔ایک کشتی حبشہ جارہی تھی انہوں نے فی کس نصف دینار کرایہ ادا کیا۔۔۔"(17)

اس ضمن میں علامہ حلبی کی عبارت مندرجہ ذیل ہے:

"ان حضرات صحابہ نے مکہ سے بڑی خاموشی اور رازداری کے ساتھ ہجرت کی۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے دوجہازوں کا انتظام بھی فرمایا۔ یہ تاجروں کے جہاز تھے اور وہ تاجران لوگوں کو نصف دینار کی اجرت پر لے جانے پر راضی ہوگئے ۔۔"(18)

یہاں علامہ حلبی ایک ہی عبارت میں دومختلف باتیں لکھتے ہیں یعنی عبارت کے پہلے حصہ میں دوجہازوں کاذکر کیاہے جب کہ عبارت کے دوسرے حصہ میں کتاب مواہب کے حوالے سے ایک جہاز کا ذکر کرتے ہوئے اس کاکرایہ نصف دینار لکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ علامہ حلبی کی مذکورہ عبارت مہاجرین کے کرایہ پر اٹھنے والی رقم کا تخمینہ پیش کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ جب کہ علامہ شبلی نعمانی یوں رقم طراز ہیں: "ان لوگوں نے پانچ نبوی ماہ رجب میں سفر کیا۔ حسن اتفاق یہ کہ جب یہ لوگ بندرگاہ پر پہنچے تو دوتجارتی جہاز حبش کو جارہے تھے۔ جہاز والوں نے سستے کرایہ پر ان کو بٹھالیا۔ہر شخص کو صرف پانچ درہم دینے پڑے"۔(19)

اب تک کے حوالوں کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والوں میں سے ہر مسافر حبشہ تک جانے کے لیے مندرجہ ذیل تین کرایوں میں سے کوئی ایک کرایہ ادا کرنے کا پابند تھا۔

1. حبشہ تک کا کرایہ ہر مسافر کا نصف دینار مقرر تھا۔
2. مہاجرین حبشہ نے نصف دینارپر پوری جہاز کو کرایہ پر لیا تھا اس کی وضاحت اوپر کی گئی ہے۔
3. ہر مسافر کا کرایہ مکہ سے حبشہ تک کے لیے پانچ درہم مقرر تھا۔

نتیجہ کے طور پر یہ کہاجاسکتاہے کہ مسلمانوں کی کثیر تعداد نے حبشہ تک کاکرایہ نصف دینار یاپانچ درہم کے طور پراداکیا۔چونکہ سابقہ روایات میں مہاجرین حبشہ کی متفق علیہ تعداد سامنے نہیں آتی ہے اس لیے ہم نصف دینار یاپانچ درہم کے اعتبار سے کوئی تخمینہ پیش نہیں کرسکتے۔ البتہ سیرت نگاروں کے اس غیرمتفقہ ا قوال کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہجرت حبشہ اولی میں مہاجرین کی تعداد سولہ اور ہجرت حبشہ ثانیہ میں تراسی مان لی جائے توان کی کل تعداد ننانوے بنتی ہے اور اگر ہجرت حبشہ اولی میں مہاجرین کی تعداد پندرہ اور ہجرت حبشہ ثانیہ میں تراسی مان لیاجائے توان کی کل تعداد اٹھانوے بنتی ہے۔اس طرح مہاجرین حبشہ کی کرایہ نصف دینارکے حساب سے ساڑھے انچاس یا انچاس دینار بنتی ہے۔جب کہ علامہ شبلی کی عبارت کے حساب سے چار سو پچانوے یا چار سو چرانوے درہم بنتی ہے۔دور جاہلیت میں دینار کو جو حیثیت حاصل تھی اس کے متعلق نور محمد غفاری لکھتے ہیں:

"دورجاہلیت میں عربوں اور بالخصوص قریش مکہ کے ہاں یہ اوزان و پیمانے مروج تھے:

دینار: یہ سونا وزن کرنے کے لیے تھا۔

درہم: یہ چاندی وزن کرنے کے لیے تھا۔(یاد رہے کہ دیناراور درہم میں ۷اور ۱۰کی نسبت تھی یعنی دس درہم سات دینار کے برابر ہوتے تھے)

شعیر: یہ درہم کے ۱\۶۰ کے برابر تھا۔

اوقیہ: ۴۰درہم کے مساوی تھا۔

نواۃ: یہ ۵درہم کے برابر تھا۔

مثقال : یہ کسی کسر کے ساتھ ۲۲قیراط کے مساوی تھا۔مصری مثقال ۲۴ قیراط کے برابر تھا۔

رطل: ۱۲اوقیہ کے برابر تھا۔ (20)

مذکورہ عبارت سے یہ نتیجہ نکلتاہے کہ دورجاہلیت میں درہم ودینار سب سے بڑی رقم تصور کی جاتی تھی۔ مہاجرین حبشہ نے صرف مکہ سے حبشہ تک کرایہ کی مدمیں اتنی کثیر رقم کوخرچ کیاجب کہ حبشہ سے واپسی کاکرایہ اوردیگر اخراجات کے لئے یقینا مزید رقم بھی خرچ ہوئی ہو گی۔لیکن یہاں پھر یہ سوال باقی ہے کہ یہ سب اخراجات کہاں سے پورے ہوئے؟ سیرت نگاراس

ضمن میں خاموش ہیں۔لیکن یہ اندازہ ضرور لگایا جاسکتاہے کہ اتنی کثیر رقم خرچ کرکے مہاجرین کو حبشہ پہنچانے کاانتظام کرنا، سوائے حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) کے مال ودولت کے ہمیں کوئی اور سرمایہ آنحضرتؐ اور مسلمانوں کے پاس نظر نہیں آتا۔ چنانچہ مہاجرین کی کامیاب ہجرت اور حبشہ میں اسلامی تعلیمات کو صحیح شکل میں پیش کرنے کا موقع فراہم کرنے میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) کی مال ودولت کا بہت بڑا کردار ہے۔

کفارمکہ کی طرف سے معاشی بائیکاٹ:

بائیکاٹ ایک ایسا عمل ہے جو مخالفین پر آخری ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ مدمقابل مالی، علمی، جسمانی اور روحانی اعتبار سے بائیکاٹ کرنے والوں کامحتاج ہوتا ہے،اس لیے وہ اپنے جائز ناجائز مطالبات منوانے کے لیے اسے سماجی اور معاشی دباؤ میں رکھتے ہیں تاکہ مدّمقابل اپنی خود مختاری کو نظرانداز کرکے درپردہ غلامی کی زندگی کو اپنانے پر مجبور ہو جائے۔دراصل، کفار قریش نے بنی ہاشم اور بنی مطلب کی افرادی قوت اور شجاعت وبہادری اور ابوطالب کے آنحضرتؐ کے متعلق محتاط رویے کی وجہ سے کفار مکہ کم از کم آنحضرتؐ کی زندگی کو نقصان پہنچانے سے باز رہے۔اس لیے کفار قریش بڑے غوروحوض کے بعداس بات پر متفق ہوگئے کہ اگر بنی ہاشم اور بنی مطلب کوہمارا کوئی عمل نقصان پہنچاسکتا ہے تووہ یہ ہے کہ ہم ان سے خرید وفروخت سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کریں۔لہٰذاانہوں نےایک طرح سے بنی ہاشم کے ساتھ اقتصادی بائیکاٹ کیا۔اس بائیکاٹ کے حوالے سےابن ہشام بیان کرتے ہیں کہ:

> ”قریش نے باہم اتفاق کرکے ایک عہد نامہ لکھاجس کا مضمون یہ تھاکہ بنی ہاشم اور بنی مطلب سے شادی نہ کریں، نہ اپنی بیٹی ان کو دیں اور نہ ان کی بیٹی آپ لیں اور نہ ان کی کوئی چیز خریدیں اور نہ ان کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کریں اور اس عہد نامہ کو لکھ کر انہوں نے زیادہ پختگی کے واسطے کعبہ شریف کے اندر لٹکادیا“۔(21)

کفارقریش بنی ہاشم اور بنی مطلب پر سب سے زیادہ تجارت روک کر دباؤ ڈال سکتے تھے۔اس لئے انہوں بنی ہاشم کے ساتھ خریدوفروخت کو نشانہ بنایا۔بقول ابن ہشام:

"جب قریش نے یہ عہد کیا کہ بنی ہاشم اور بنی مطلب سے کسی چیز کی خرید وفروخت نہ کریں گے تو تمام قریش نے اس عہد پر دستخط کیے تھے اور اس عہد سے بنی ہاشم کو بہت نقصان پہنچا اور وہ بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔" (22)

کفار قریش کے بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب کے ساتھ اس بائیکاٹ کے حوالے سے طبری کا بیان بھی ابن ہشام سے کافی حد تک متفق ہے۔ اس حوالے سے علامہ طبری کا مزید کہنا یہ ہے کہ:

" قریش کے اس بندوبست پر بنوہاشم اور بنوعبدالمطلب، ابوطالب کے پاس چلے گئے اور ان کے ساتھ ان کی گھاٹی میں جا کر رہے۔ بنی ہاشم میں سے ابولہب عبدالعزیٰ بن عبد المطلب قریش کے پاس گیا اور اس نے ابوطالب کے مقابلے میں ان کی امداد کی۔ دو یا تین سال مسلمان اسی بے کسی کی حالت میں رہے، یہاں تک کہ ان کا زندگی گزارنا مشکل ہو گیا۔ کھانے پینے کی تکلیف ہونے لگی۔ کوئی چیز ان کو پہنچتی نہ تھی؛ البتہ اگر قریش میں سے کوئی ان پر ترس کھا کر کوئی چیز بھیجنا چاہتا تو خفیہ طور پر پہنچاتا۔" (23)

اس بائیکاٹ سے وہ تین قسم کے فوائد حاصل کرنا چاہتے تھے۔

1. مال ودولت جمع کرنے کی ہوس میں، ممکن ہے بنی ہاشم اور بنی مطلب کے تجارت پیشہ افراد خاندان سے علیحدہ ہو کر ہم سے مل جائیں۔
2. کفار قریش کے تجارت پیشہ اشخاص اپنی تجارت کو مستحکم کرنے کے لیے بنی ہاشم اور بنی مطلب خصوصاً آنحضرتؐ کی تجارت کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔
3. آنحضرتؐ کے پسندیدہ اخلاق وعادات کی وجہ سے پورا معاشرہ آپؐ سے جڑا ہوا تھا۔ کفار قریش قبائلی عصبیت کے ذریعے ان لوگوں کو آپؐ سے جدا کرنا چاہتے تھے۔

جہاں تک عام لوگوں کو آپؐ سے جدا کرنے کی بات ہے تو اس کے لیے انہوں نے شادی بیاہ اور بات چیت نہ کرنے کی شرط معاہدے میں شامل کی تھی تاکہ سیدھے سادھے لوگ اپنی جاہلیت کی وجہ سے اس کام کو مذہبی فریضہ کے طور پر بجالائیں اور کفار قریش کے تجارت پیشہ افراد کے سرمایہ کو بڑھانے کا باعث بنیں۔ ذیل میں ہم مزید حوالے پیش کریں گے جس سے یہ اندازہ

ہوگاکہ کفارقریش کامقاطعے کا عمل کتناسخت تھااور کفار قریش نے کس چالاکی سے لوگوں کے مذہبی اور عصبیتی جذبات کو ابھاراتھا۔

کفار قریش کے بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب کے ساتھ بائیکاٹ کے بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب پر سخت اجرات کے حوالے سے ابن قیم کا کہنا یہ ہے کہ: " یہ لوگ تین سال تک اس جگہ محصور و نظر بند رہے۔ان کو تمام ضروریات زندگی مہیا کرنی بند کر دی گئیں۔ یہاں تک کہ انہیں سخت اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔" (24)

بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب کے خلاف کفار قریش کے اس اکٹھ اور بائیکاٹ کے حوالے سے ابن کثیر کی درج ذیل عبارت بھی قابل ذکر ہے:

" ان حالات کے پیش نظر اور مشرکین قریش کے روزافزوں ظلم وستم سے تنگ آکر مسلمانوں نے آنحضرتؐ کی اجازت اور باہمی اتفاق رائے کے تحت فیصلہ کیا کہ وہ شعبِ ابوطالب میں پناہ گزین ہوجائیں۔۔۔مشرکین قریش نے انہیں وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔انہوں نے مکے کے بازاروں میں پوشیدہ طور پر ان کی آمدورفت اور کبھی کبھار کھانے پینے کی چیزیں خرید کرلے جانے پر بھی قدغن لگادی۔اس کے علاوہ، وہ آپؐ کو پیغامات کے ذریعہ قتل اور آپؐ کے ساتھیوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کی دھمکیاں بھی دیتے رہے"۔(25)

قریش کے اس بائیکاٹ کے حوالے سے مولانا مودودی رقمطراز ہیں کہ:

" انہوں نے بالاتفاق ایک دستاویز لکھی جس میں اللہ کی قسم کھاکر یہ عہد کیا گیاتھاکہ جب تک بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب، محمد (ﷺ) کو ان کے حوالہ نہ کریں اس وقت تک ان سے میل جول،شادی بیاہ، بول چال اور خریدوفروخت کاکوئی تعلق نہ رکھاجائے گا۔ قریش کے تمام خاندانوں کے سربراہوں نے اس دستاویز کی توثیق کی اور اسے خانہ کعبہ میں لٹکادیاگیا"۔(26)

قریش کے بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب کے خلاف اس پیمان کے حوالے سے عبدالدائم لکھتے ہیں:

"قریش نہ تو بنی ہاشم کے ساتھ خود خریدوفروخت کرتے تھے،نہ کسی دوسرے کو کرنے دیتے تھے۔اگر باہر سے کوئی تجارتی قافلہ مکہ آتااور بنی ہاشم کاکوئی فرد اس سے کوئی چیز خریدنا چاہتاتو

ابولہب زیادہ قیمت دے کر وہ چیز حاصل کرلیتااور بے بس ہاشمی خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا"۔(27)

مذکورہ عبارتوں کی روشنی میں یہ کہاجاسکتاہے کہ کفارقریش کے اس مقاطعے کے عمل سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آئے۔

1. علامہ طبری کے قول کے مطابق "ابولہب عبدالعزیٰ بن المطلب قریش کے پاس گیا اور اس نے ابوطالب کے مقابلے میں ان کی امداد کی"جب کہ ابن قیم لکھتے ہیں"پھر بنوہاشم اور بنومطلب میں سے بعض اہل ایمان اور بعض اہل کفر سے مل گئے"۔
2. سیدھے سادھے لوگوں نے اس مقاطعے کو خالصتا مذہبی بنیادوں پر لیاکیونکہ مقاطعہ کرنے کا جومعاہدہ ہوا تھا اس کی تحریریں خانہ کعبہ کی چھت یادیوار پر لٹکادی گئی تھیں اس طرح عوام الناس کی نظریں روز اس معاہدے پر پڑتی تھیں جس کی وجہ سے وہ تجدیدوفاکاعزم کیاکرتے تھے۔
3. کفارقریش کی حمایت میں جولوگ تھے وہ کھل کر میدان میں آگئے اورآنحضرتؐ سے اعلانیہ دشمنی کا اظہار کرنے لگے۔
4. اس مقاطعے سے نہ صرف بنی ہاشم اور بنی مطلب کی تجارتی سرگرمیاں بری طرح متاثر ہوئیں بلکہ انہیں اس بات کا بھی یقین ہوگیا کہ کسی بھی وقت کفار قریش میں سے کوئی شخص چھپ کر آنحضرتؐ پر وار کرسکتاہے۔
5. کفارقریش کی بڑھتی ہوئی دشمنی کے پیش نظر آنحضرتؐ کی حمایت کرنے والے شعب ابی طالب کو اپنے مسکن کے طور پر اپنانے پر مجبور ہوگئے۔
6. آنحضرتؐ کی حمایت کرنے والے جب شعب ابی طالب میں چلے گئے تو کفار قریش کو موقع مل گیاجس کی وجہ سے انہوں نے اس دورانیہ میں بھرپورطریقے سے عوامی حمایت کا فائدہ اٹھایا اورآنحضرتؐ کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت کے جذبات بھردیئے۔

شعب ابی طالب اور حضرت خدیجہ کا ایثار

یہ ایک حقیقت ہے کہ شعب ابی طالب میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) کی دولت وثروت مسلمانوں کے کام آئی اور بنی ہاشم اور بنی مطلب کے علاوہ آنحضرتؐ کی حمایت کرنے والے تین سال کے طویل عرصے تک شعب ابی طالب میں تمام تر پابندیوں کے باوجود زندگی گزارنے میں کامیاب ہوئے۔علامہ حلبی لکھتے ہیں:

"ایک روز ابوجہل کو راستے میں حکیم بن حزام ملے۔ان کے ساتھ ان کا غلام تھا جو کچھ گیہوں اٹھائے ہوئے تھا جسے حضرت حکیم ابن حزام ام المومنین حضرت خدیجہؑ کے پاس لے جانا چاہتے تھے۔ حضرت خدیجہؑ آنحضرت ﷺ کے ساتھ شعب ابوطالب میں ہی تھیں۔ابوجہل نے حکیم کو دیکھا تو ان کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا: کیا تم بنی ہاشم کے پاس کھانا لے کر جاؤ گے۔خدا کی قسم! ہرگز نہیں، ورنہ میں تمہیں سارے مکے میں رسوا کروں گا۔اس پر ابوالبختری ابن ہشام نے ابوجہل سے پوچھا کیا بات ہے؟ تو ابوجہل نے کہا: یہ بنی ہاشم کے پاس کھانا لے کر جانا چاہتے ہیں۔ابوالبختری نے کہا یہ کھانا تو یہ اپنی پھوپھی (خدیجہؑ) کے پاس لے جارہے ہیں جو وہاں اپنے شوہر کے ساتھ ہیں(اور خدیجہ بنی ہاشم میں سے نہیں ہیں) تو کیا اب تم ان کو اپنی پھوپھی کے پاس جانے سے بھی روکوگے۔ہٹو!ان کا راستہ چھوڑدو۔"(28)

شعب ابی طالب کے محصورین میں سے بنوہاشم اور بنوعبدالمطلب کے ساتھ کوئی بھی تاجر کفار مکہ کے معاشی بائیکاٹ کی وجہ سے خرید وفروخت کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا تھا۔جب کہ بقیہ محصورین میں سے سوائے حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) کے کوئی بھی مالی اعتبار سے اتنا خوشحال نہیں تھا کہ وہ کفار مکہ یا باہر سے آئے ہوئے تاجروں کے منہ مانگے دام ادا کرکے کوئی چیز خرید سکے۔ان وجوہات کی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شعب ابی طالب کے محصورین کی بھوک،پیاس مٹانے کے لیے ایک طرف حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) کا مال وثروت کام آیا، وہاں دوسری طرف آپ کے خاندان والوں کی غیرت کام آئی اور انہوں نے آپ کے غیر ہاشمی ہونے کی حیثیت سے فائدہ اٹھایا اور شعب ابی طالب کے محصورین کی بھرپور مدد کی۔خلاصہ کے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ:

1. حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) کی موروثی خصوصیات اسلام کی نشرواشاعت کے سلسلے میں مددگار ثابت ہوئیں اور آنحضرتؐ کی حمایت ونصرت کے لیے خاندان بنوہاشم اور بنوعبدالمطلب کے

علاوہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا خاندان بھی پیش پیش رہا۔ ظاہر ہے اس حمایت کے پیچھے حضرت خدیجۃالکبریٰ(س) کی ذاتی صفات کارفرما تھیں۔

2. حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) کی ذات میں کچھ ایسے فضائل تھے جن کی بدولت آپ نے انسان کے مقصدحیات کا باریک بینی سے مطالعہ کیااور اپنے لیے زندگی گزارنے کے جواصول وضوابط متعین کیے وہ آنحضرتؐ کی سیرت سے مطابقت رکھتے تھے۔ با الفاظِ دیگر حضرت خدیجۃالکبریٰ(س) کی زندگی اسلامی تعلیمات کے آنے سے پہلے ہی ان تعلیمات کے تحت گزررہی تھی جس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ کی زندگی کاہر پہلوپسندیدہ اخلاق اور اعلی کردار سے عبارت ہے۔
3. حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) نے آنحضرتؐ کے اخلاق وعادات کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایاتھا کہ آپؐ ہی نبی آخرالزمانؐ ہیں۔اس لیے آپ نے اطاعت وفرمانبرداری کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا جسے دیکھ کر اللہ کے آخری رسولؐ اپنی زندگی کے آخری ایام تک آپ کوخراج عقیدت پیش کرتے رہے۔
4. حضرت خدیجۃالکبریٰ(س) کی ذات کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آنحضرتؐ نے سب سے پہلے الٰہی منشورسے آپ ہی کو آگاہ فرمایاجسے سن کرآپ نے فوراً نبوت کی تصدیق کی اور آپؐ کے ساتھ نماز اداکی۔
5. حضرت خدیجۃالکبریٰ(س) کی دولت کا ایک مصرف گھریلو اخراجات خصوصاً مہمانوں کی ضیافت کے علاوہ یتیموں، مسکینوں اور نادار رشتہ داروں کی اولاد کی تربیت وپرورش کے ضمن میں تھا۔
6. سرزمین عرب میں نازل ہونے والی قدرتی آفتیں خصوصاً خشک سالی اور قحط کے متاثرین کی بحالی کے لیے حضرت خدیجۃالکبریٰ(س) کی دولت کام آتی رہی۔
7. خانہ کعبہ کی تعمیروتوسیع کے کاموں میں حضرت خدیجۃالکبریٰ(س) کی پاکیزہ دولت کام آئی کیونکہ مکہ کے اکثرصاحب ثروت لوگوں کامال حرام ذرائع سے کمایاہواتھا،یاکسی یتیم اورکمزور شخص سے چھینا ہواتھا۔
8. خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے جو لوگ دور دراز کے علاقوں سے سفر کرکے مکہ آتے تھے ان کی ضیافت ومہمان نوازی کے ضمن میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) کی دولت خرچ ہوتی رہی۔

9. ابتدائی طور پر آنحضرتؐ اسلام کی دعوت و تبلیغ کا کام خفیہ طور پر انجام دیتے تھے۔ظاہر بات ہے جن لوگوں تک یہ پیغام پہنچایا جاتا تھا انہیں دعوت دینے سے پہلے کھانے پینے کا انتظام بھی کیا جاتا تھا جب کہ ان دعوتوں کا سلسلہ اعلانیہ تبلیغ کی حد تک تو تاریخی طور پر ثابت ہے اور ان دعوتوں کے اہتمام میں بھی حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) کی دولت خرچ ہوتی رہی۔ لہٰذا اس بات کے ثبوت کے طورپر دعوت ذوالعشیرہ کی ضیافت کے واقعات کو پیش کیاجاسکتا ہے کیونکہ آنحضرتؐ نے رشتہ داروں کے سامنے اسلامی تعلیمات کوپیش کرنے سے پہلے ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام فرمایا تھا۔

10. اس دور میں غلاموں اورکنیزوں کی بہات سے بھی کوئی انکارنہیں کر سکتا۔آنحضرتؐ اورحضرت خدیجۃالکبریٰ(س) یقینا اس معاشرتی برائی کوختم کرنے کے لیے ہمہ وقت پیش پیش رہتے تھے۔چنانچہ حضرت خدیجۃالکبریٰ(س) کی دولت کا ایک مصرف غلاموں اورکنیزوں کی آزادی بھی تھا۔

11. حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والوں کی اکثریت مالی اعتبار سے تنگ دست تھی۔ چنانچہ ان کے تمام اخراجات کو حضرت خدیجۃالکبریٰ(س) کی دولت سے پورا کیا گیا۔

12. شعب ابی طالب میں کفار مکہ کا معاشی بائیکاٹ اس بات کو تقویت پہنچاتا ہے کہ دوران محصوری حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) کی دولت کام آئی۔

13. حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) کی ذات سے مربوط دولت کے کردار کے علاہ بقیہ مساعی جمیلہ بھی اسلام کی تبلیغ وترویج کے سلسلے میں کام آتی رہیں۔ خصوصاًشعب ابی طالب کی محصوری میں حکیم بن حزام کاچھپ چھپاکرکھانے پینے کی چیزوں کا پہنچانا، اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) نے مشکل وقت میں آنحضرتؐ کا ساتھ دینے کے لیے اپنے رشتہ داروں سے بھی مدد لی۔

14. آنحضرتؐ کی تمام بیویوں کوامھات المؤمنین ہونے کاجوالٰہی لقب ملا،اُس کی روشنی میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح ہر ماں اپنے بچوں کے لئے اپنا تمام مال لٹا دیتی ہے، اسی طرح حضرت خدیجۃ الکبریٰ(س) نے بھی اپنا تمام مال ودولت اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی فلاح

وبہبود کے کاموں میں خرچ کیا۔اس لحاظ سے یہ کہنامناسب معلوم ہوتاہے کہ آپ نے ظاہری اور باطنی دونوں اعتبارسے "**اُمُّ المؤمنین**" ہونے کاپوراپوراحق اداکیا۔

حوالہ جات

1۔ابن ہشام،ابو محمد عبدالملک، سیرۃالنبی(کامل)ابن ہشام، مترجم سیدیسین علی حسنی نظامی دہلوی، ص۱۵۶

2۔الشعراء/ 214

3۔حلبی،علامہ علی ابن برہان الدین،ام السیر سیرۃ حلبیہ اردو، مترجم مولانامحمد اسلم قاسمی، جلداول نصف آخر، ص۲۵۳۔۲۵۴

4۔ایضاً، جلداول نصف آخر، ص۲۵۴

5۔الطبری،علامہ ابی جعفر محمد بن جریر، تاریخ طبری، مترجم سید محمدابراہیم، حصہ اول، ص۵۰۳

6۔حلبی، علامہ علی ابن برہان الدین،ام السیر سیرۃ حلبیہ اردو، مترجم مولانامحمد اسلم قاسمی، جلداول نصف آخر، ص۴۴۴

7۔ایضاً، جلداول نصف آخر، ص۴۴۴

8۔ابن کثیر،علامہ حافظ ابوالفداعمادالدین،تاریخ ابن کثیرالبدایہ والنہایہ، مترجم پروفیسر کوکب شادانی، ج۵، ص۵۳۴۔۵۶۶

9۔ شبلی نعمانی، علامہ، سید سلیمان ندوی،، سیرۃ النبیؐ، ، ج۱، ص۲۰۷

10۔ایضا، ج۱، ص۱۵۱

11۔ابن ہشام،ابو محمد عبدالملک، سیرۃالنبی(کامل) ابن ہشام، مترجم سیدیسین علی حسنی نظامی دہلوی، ج۱، ص۲۰۷۔۲۰۸

12۔ایضاً، ج۱، ص۲۱۳

13۔ابن کثیر، علامہ حافظ ابوالفداعمادالدین،تاریخ ابن کثیرالبدایہ والنہایہ، مترجم پروفیسر کوکب شادانی، ج۳، ص۱۲۷

14۔ایضاً، ج۳، ص۱۳۲

15۔الطبری،علامہ ابی جعفر محمد بن جریر، تاریخ طبری، مترجم سید محمدابراہیم، حصہ اول، ص۹۵

16۔الازھری، پیر محمد کرم شاہ، ضیاء النبی، ج۲، ص۳۴۳

17۔الازھری، پیر محمد کرم شاہ،ضیاء النبی، ج۲،ص،۳۴۴بحوالہ احمد بن زینی دحلان، السیرۃ النبویہ،ج۱،ص، ۲۴۵

18۔حلبی، علامہ علی ابن برہان الدین،ام السیر سیرۃ حلبیہ اردو، مترجم مولانامحمد اسلم قاسمی، جلداول نصف آخر، ص۳۶۱

19۔الازھری، پیر محمد کرم شاہ، ضیاء النبی، ج۲، ص۱۵۰۔۱۵۱

20۔پروفیسر ڈاکٹرنور محمد غفاری، نبی کریمؐ کی معاشی زندگی، ص، ۳۱۔۳۲

21۔ابن ہشام، ابو محمد عبدالملک، سیرۃ النبی (کامل) ابن ہشام، مترجم سید یسین علی حسنی نظامی دہلوی، ج۱، ص۲۲۹۔۲۳۰
22۔ایضاً، ج۱، ص۲۴۷
23۔الطبری، علامہ ابی جعفر محمد بن جریر، تاریخ طبری، مترجم سید محمد ابراہیم، حصہ اول، ص۱۰۰۔۱۰۱
24۔ابن قیم، علامہ حافظ ابی عبداللہ محمد، زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، مترجم رئیس احمد جعفری، حصہ دوم، ص۶۸۸
25۔ابن کثیر، علامہ حافظ ابوالفداعمادالدین، تاریخ ابن کثیر البدایہ والنہایہ، مترجم پروفیسر کوکب شادانی، ج۳، ص۱۴۰
26 ۔مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، سیرت سرور عالمؐ، ج۲، ص۶۱۳، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، اگست۱۹۷۹ء
27۔دائم، عبدالدائم دائم، قاضی، سید الوریٰ جان دوعالم ﷺ کی سیرت مطہرہ، ج۱، ص۲۶۲، جنگ پبلشرز، جولائی۱۹۹۶ء
28۔حلبی، علامہ علی ابن برہان الدین، ام السیر سیرۃ حلبیہ اردو، مترجم مولانا محمد اسلم قاسمی، جلد اول نصف آخر، ص۴۰۹

دینی کثرتیّت، ایک تنقیدی جائزہ

سید علی جواد ہمدانی*
alihamadani@gmail.com

کلیدی کلمات: کثرتیت، پلورلزم، ادیان، ارتیابیت، اضافیت، مسیحیت، اسلام، استعمار

خلاصہ

دینی کثرتیّت، الٰہیات میں متعدد ادیان کے باب میں ایک کلامی نظریہ ہے جس کی رو سے تمام ادیان معتبر، حق اور نجات کا باعث ہیں۔ اس نظریے کے مطابق، حقیقت کسی خاص دین یا مذہب سے مخصوص نہیں، بلکہ ہر دین ایک حد تک حقیقت سے بہرہ مند ہے اور حق (The Reality) کی طرف جانے کا راستہ ہے۔ اگرچہ "دینی کثرتیت" مسیحی علم کلام کا ایک ایسا نظریہ ہے جو انسانی نجات کو تمام ادیان کی حقانیت میں تلاش کرتا ہے، تاہم اس نظریہ کے پس منظر میں ایک سیاسی تاریخ خوابیدہ ہے۔ دراصل، یہ نظریہ جہاں عہد وسطی کے کلیسا کے لوگوں کے عقائد کی تفتیش کے سلسلے میں ڈھائے جانے والے مظالم کا ردعمل ہے، وہاں عصر حاضر میں اسلام کے خلاف ایک بہت گہری ابلیسی سازش کا شاخسانہ ہے۔ کیونکہ عصر حاضر میں عالم اسلام میں وہی فضا قائم کی جارہی ہے جس کے نتیجے میں عہد وسطی میں لوگوں میں دینداری سے نفرت ہوئی اور سیکولزم اور دینی کثرتیت جیسے نظریات کو پنپنے کا موقعہ ملا۔

*۔اسٹوڈنٹ ایم فل، اسلامک فلاسفی، مصطفیٰ انٹرنیشنل یونیورسٹی، قم ایران۔

دینی کثرتیت کی بحث کی اہمیت

"دینی کثرتیّت" (Religious Pluralism (1)، مسیحی الٰہیات کا ایک کلامی نظریہ ہے جس کی رو سے تمام ادیان معتبر، حق اور نجات کا باعث ہیں۔ اس نظریے کے مطابق، حقیقت کسی خاص دین یا مذہب کا خاصہ نہیں، بلکہ ہر دین ایک حد تک حقیقت سے بہرہ مند ہے اور حق (The Reality) تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ یوں دینی کثرتیت، مسیحی علم کلام کا ایک ایسا نظریہ ہے جو انسانی نجات کو تمام ادیان کی حقانیت میں تلاش کرتا ہے اور تمام ادیان کو سچا مانتے ہوئے انہیں حق تک پہنچنے کے مختلف راستے تصور کرتا ہے۔

اس نظریے کا بغور جائزہ لینے کے لئے اس کے تاریخی پس منظر پر مختصر نظر ڈالنے اور اس کی پیدائش میں کارفرما اسباب اور عوامل کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ دراصل، "دینی کثرتیّت" کا موضوع دراصل، عہد وسطیٰ کے دینداروں کے عقائد کی تفتیش (Inquisition) کے سلسلے میں ڈھائے جانے والے مظالم پر سامنے آنے والے ردّ عمل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس نظریے کا شمار اُن نظریات و عقائد میں ہوتا ہے جو یورپ میں عہد وسطی کی منحرف مسیحیّت کے دہشت گردانہ کردار کا ردعمل ہیں۔ مسیحی چرچ نے اس عہد میں لوگوں کے اعتقادات کی تفتیش کرکے مخالفین پر بے پناہ مظالم ڈھائے اور کئی انسانوں کو زندہ جلایا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا نشاۃ ثانیہ میں عیسائیت کے خلاف شدید ردّ عمل ظاہر سامنے آیا اور عام لوگوں کے ذہن میں دین اور دینداری سے شدید نفرت اور دوری ایجاد ہوئی۔ یوں یورپ میں انسان پرستی، مادیّت پرستی، تجریّت اور دینی کثرتیت اور سیکولرازم جیسے اعتقادات اور نظریات کا آغاز ہوا۔ اس ردّ عمل کی بدولت دین کو زندگی کے تمام شعبوں سے نکال باہر کرنے کے بعد محض ایک نمایشی کردار تک محدود کر دیا گیا۔

جو امر اس موضوع پر بحث کی اہمیت کو بہت بڑی حد تک بڑھا دیتا ہے وہ یہ ہے کہ آج عالمِ مشرق میں عہد وسطی کی عیسائیت کی تاریخ دہرائی جارہی ہے۔ پھر ابلیس اپنا وہی پینترا اسلامی شدت پسندی (القاعدہ، طالبان اور آخری کردار داعش) کے نام پر دین مبین اسلام کے خلاف آزمانے کے درپے ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ آج ابلیسی طاقتیں، اسلام کے خلاف وہی حربہ آزمارہی ہیں جو انہوں نے عیسائیت کے خلاف اپنایا۔ آیا طالبان اور داعش جیسے دہشت گرد تکفیری گروہ جن کا حقیقی اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، ایک بار پھر اسلام کے نام پر انسانیت سوز مظالم کی تاریخ دہرا کر سلیم الفطرت عام انسانوں کو اسلام اور اسلامی اقدار سے متنفر نہیں کر رہے؟! کیا وجہ ہے آج بعض مسلمان اپنے آپ کو سیکولر کہنے پر مجبور ہو رہے ہیں؟ ہمیں یقین ہے کہ اس

وقت مشرق وسطی بلکہ پورے عالم اسلام میں مسلمانوں کا کافر قرار دینے والے گروہ یہودی استعماری ایجنڈے پر چلتے ہوئے عالم اسلام میں وہی فضا قائم کرنا چاہتے ہیں جو عہد وسطی میں کلیسا پر حاکم تھی۔

ان کا ہدف یہ ہے کہ جس طرح کلیسا اپنی موت خود مر گیا اور انسان کی عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا، اسی طرح اسلام کو بھی انسانوں کی عملی زندگی اور سیاست کے میدان سے بے دخل کر دیا جائے۔ اور ایسا اسی وقت ہو سکتا ہے جب عالم اسلام میں وہی فضا ایجاد کر دی جائے جو عہد وسطی میں کلیسا نے یورپ میں ایجاد کر رکھی تھی۔ اگر خدانخواستہ یہاں وہی فضا حاکم ہو گئی تو اس کے بعد عالم اسلام میں بھی "دینی کثرتیت" جیسے باطل نظریات کو ہوا دے کر دین اسلام کی حقانیت کو مسخ کرنا آسان ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں یورپ میں پادری سے عہد وسطی کے کلیسا کے مظالم پر عذر خواہی کروائی جا رہی ہے، وہاں پوری دنیا سے کرائے کے سپاہی اکٹھے کر کے داعش جیسے دہشت گرد گروہوں کی فوج میں شامل کیے جا رہے ہیں۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ابلیسی اور طاغوتی طاقتوں کے اس کام کو ان کے تیار کردہ کئی نام نہاد مسلمان حکمرانوں اور ہرکاروں نے مزید آسان کر دیا ہے اور وہ پس پردہ القاعدہ، طالبان اور داعش جیسے دہشت گرد گروہوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

یقینا یہ ایک بہت بڑی ابلیسی اور استعماری سازش ہے جس کا مقابلہ کرنا ہر دردمند اور باشعور مسلمان کا فریضہ ہے۔ لہٰذا جہاں چند احمق و نادان کلمہ گو تکفیری گروہوں کا ساتھ دے رہے ہیں، وہاں تمام مسالک کے علماء اور دانشوروں کی ذمہ داری ہے کہ معاشرے میں حقیقی اسلام کی روح کو عام کریں اور اسلام کا پیغام انسانیت، پیغام فلاح و نجات اور پیغام امن و صلح عام کریں تاکہ دہشت گرد، منحرف مسلمانوں اور ان کے آقاؤں کے ہتھکنڈے سے آنے والی نسلوں کو بچایا جاسکے۔ ہمیں یقین ہے کہ ابلیسی طاقتیں اسلام کے خلاف کبھی وہ کامیابی حاصل نہیں کر پائیں گی جو انہیں عیسائیت کے خلاف حاصل ہوئی۔ اس لئے کہ عیسائیت منحرف ہونے کے ساتھ ساتھ قابل تنسیخ بھی تھی اور اسلام کے ظہور کے ساتھ ہی اس کی معینہ مدت ختم ہو چکی تھی۔ لیکن اسلام ایک ناقابل تنسیخ دین ہے۔ اس دین کی حفاظت کی ذمہ داری خود خداوند ذوالجلال نے لی ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ۔ (2)

یعنی: "بے شک ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

بہر صورت، اس مقالہ میں اگرچہ ایک دقیق فلسفی، کلامی بحث پیش کی جا رہی ہے۔ جہاں یہ بحث فلسفی، کلامی منظر سے ایک دقیق اور اساسی بحث ہے، وہاں یہ بحث عالم اسلام کے دانشوروں کو دین اسلام کے خلاف ایک بہت بڑی سازش سے بھی روشناس کرواتی ہے۔

دینی کثرتیّت کا تاریخی پس منظر

دینی کثرتیّت کی بحث کو سمجھنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے انسانی نجات کے بارے میں یہودیّت اور عیسائیّت کے نظریات کو سمجھنا ہو گا۔ دراصل، رائج یہودیت اور عیسائیت کا نظریہ بہت "تنگ نظرانہ" (Exclusivist) ہے۔ روایتی طور پر عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ صرف وہی لوگ جنت میں جائیں گے اور نجات پائیں گے جو مسیحیت کی بنیادی تعلیمات پر ایمان رکھتے ہوں گے۔ انسان کی نجات صرف حضرت عیسیٰ ؑ کی الوہیت اور ربوبیت، ان کے خدا کا بیٹا ہونے اور انسانیت کے ازلی کفارے کی خاطر ان کی موت پر ایمان رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہودی بھی عیسائیوں جیسا شدت پسندانہ اور تنگ نظرانہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ قرآن کریم نجات اور ہدایت کے سلسلے میں ان کے دعوؤں کی اس طرح وضاحت فرماتا ہے:

وَ قَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلاَّ مَنْ كَانَ هُوداً أَوْ نَصَارىٰ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ

... وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارىٰ عَلىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلىٰ شَيْءٍ... (3)

ترجمہ: "انہوں (یہودیوں) نے کہا کہ جنّت میں یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ کوئی داخل نہ ہوگا. یہ محض ان کی آرزوئیں ہیں۔ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم سچّے ہو تو اپنی دلیل لے آؤ...اور یہودی کہتے ہیں کہ نصاریٰ کا مذہب کچھ نہیں ہے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودیوں کی کوئی بنیاد نہیں..."

ان کا نظریہ اس قدر تنگ نظرانہ اور محدود ہے کہ چند افراد کے علاوہ کوئی بھی نجات حاصل نہ کر پائے گا اور جنت میں داخل ہونے سے روک دیئے جائیں گے۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ سمیت تمام عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حتیٰ وہ افراد جو حضرت عیسی علیہ السلام سے پہلے زندگی گزار چکے ہیں یا وہ جو ان کے ہم عصر تھے یا ان کے بعد دنیا میں آئے لیکن ان تک عیسائیت کا پیغام نہ پہنچا ہو، ان میں سے کوئی بھی نجات نہ پائے گا۔ اس طرح مسیحی علم کلام میں انسانی نجات کے نظریہ کی بنیاد پر صرف وہی لوگ نجات پائیں گے اور غضب الہی اور جہنم سے چھٹکارہ حاصل کر پائیں گے جو حضرت عیسیٰ ؑ کی الوہیت اور ان کی ازلی کفارے کی خاطر موت پر ایمان رکھتے ہوں۔

عیسائی عقیدے کے مطابق تمام انسان گناہ گار ہیں اور حضرت آدم ؑ کے اس گناہ میں شریک ہیں جس کی وجہ سے وہ جنت سے نکالے گئے تھے۔ اس گناہ کا بوجھ ہمیشہ انسانوں کے کندھوں پر رہا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ ؑ جو خداوند کے بیٹے اور خدا کا جسمانی صورت میں ظہور ہیں، صلیب پر لٹکائے گئے۔ حضرت عیسیٰ ؑ کی الوہیت اور ان کی ازلی کفارے کی خاطر موت پر ایمان انسان کا خداوند کی بخشش اور مغفرت کے شامل حال ہونے اور نجات حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ آپس کے نظریاتی اختلاف کے باوجود اس نکتے پر متفق ہیں اور ایمان کو کامیابی اور نجات کی کنجی شمار کرتے ہیں۔ یوں جو بھی اس نظریے پر ایمان نہ لائے، نجات حاصل نہ کر پائے گا، چاہے وہ حضرت عیسیٰ ؑ کے زمانے سے پہلے رہا ہو یا بعد میں۔ حتی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسی علیہ السلام جو عیسائی مذہب کے اولیاء شمار ہوتے ہیں اور عیسائی ان کے اقوال معتبر اور حجت مانتے ہیں، بہشت میں نہ جا سکیں گے، بلکہ بہشت اور جہنم کے درمیان "لیمبو" نامی ایک جگہ، جہاں کسی قسم کا ثواب اور عذاب نہ ہوگا، رہیں گے۔ وہ اسی جگہ رہیں گے یہاں تک کہ آخر کار قیامت کے دن حضرت عیسیٰ ؑ انہیں رہائی دلا کر جنت میں لے جائیں گے۔ یہ عقیدہ اس قدر غیر معقول اور شدت پسندانہ تھا کہ بعض ہم عصر عیسائی متکلمین اس کے مقابلے میں ردّ عمل ظاہر کرنے پر مجبور ہوگئے۔ لہٰذا اُن کی طرف سے طرح کے نظریات سامنے آئے:

۱۔ وسیع النظری ردّ عمل　　۲۔ دینی کثرتیت

کیتھولک متکلمین میں سے کارل رہنر (Karl Rahner, SJ 1904 –1984) نے انسانی نجات کے بارے میں تنگ نظرانہ نظریے کے مقابلے میں "وسیع النظر نظریہ" (Inclusivist) پیش کیا۔ اس نظریہ کے پیروکاروں نے غیر صالح عیسائیوں پر بھی بہشت کے دروازے کھول ڈالے اور انہیں بھی کامیاب اور اہل نجات ٹھہرایا۔ ان کے مطابق ان نیک غیر مسیحیوں کو جن کا اخلاق اور کردار مسیحی قوانین کے مطابق ہو عیسائی سمجھا جا سکتا ہے۔ رہنر نے انہیں "بے نام عیسائی" کا نام دیا جو اعزازی مسیحی شمار ہوتے ہیں۔

جان ہک (John Hick) اور ویلفرڈ اسمتھ (W. Smith) نے اس وسیع النظری پر اکتفانہ کیا بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ گئے۔ تنگ نظروں کی طرح وسیع النظر بھی اس بات پر متفق تھے کہ کامیابی اور نجات کی صرف ایک ہی راہ یعنی مسیحیّت ہے۔ لیکن ہک اور اسمتھ اس کے قائل تھے کہ ادیان میں سے ہر ایک میں حقانیّت کا کچھ نہ کچھ عنصر موجود ہے اور ہر دین حق تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ لہٰذا ہر انسان، کوئی بھی دین اور مسلک اپنا کر جنت میں جا

سکتا ہے۔ یوں انہوں نے دینی کثرتیت اور تمام مذاہب کے برحق ہونے کے نظریے کو مسیحی علم کلام میں پیش کیا اور تنگ نظروں کے مقابلے میں بڑے سخت ردّ عمل کا اظہار کیا۔

یہاں جان ہک اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے مولانا رومی کی مثنوی میں موجود اُس تمثیل کا سہارا لیتا ہے جس میں مولانا نے کہا ہے:

پیل اندر خانه تاریك بود　　عرضه را آورده بودنش هنود

چشم حس همچون کف دستست و بس　　نیست کف را بر همه او دست رس

یعنی: "ہاتھی ایک اندھیری جگہ پر تھا۔ ہندوستان والے اسے نمائش کے لئے لائے تھے: بے شمار لوگ اسے دیکھنے آئے۔ اس تاریکی میں کسی کو کچھ سجھائی نہ دیا۔ اس تاریکی میں دیکھنا ممکن نہ تھا۔ بس ہاتھ سے چھو کر ہاتھی کا تصور کرنا پڑا۔ جس کا ہاتھ ہاتھی کی سونڈھ سے ٹکرایا وہ بولا: ہاتھی ایک پرنالے کی مانند ہے۔ جس کا ہاتھ ہاتھی کے کان سے ٹکرایا، وہ بولا: ہاتھی پنکھے کی مانند ہے۔ تخیلات کے اختلاف کی وجہ سے اقوال مختلف ہوئے۔ ایک نے "دال" کا لقب دیا، دوسرے نے "الف" کہا۔ اگر ان کے ہاتھ میں کوئی شمع ہوتی تو اختلافات کی نذر نہ ہوتے۔ حس تو صرف ہتھیلی کی مانند ہے، جسے تمام حقیقت تک رسائی حاصل نہیں۔" (4)

لہٰذا جان ہک بھی اسی تمثیل کی روشنی میں دعوی کرتا ہے کہ چند نابینا افراد جنہوں نے کبھی ہاتھی نہ دیکھا تھا، ان میں سے ایک جو ہاتھی کی ٹانگوں کو چھوتا ہے کہتا ہے ہاتھی ستون مانند ہے۔ جو ہاتھی کی سونڈھ کو لمس کرتا ہے، وہ کہتا ہے: ہاتھی، اژدہا جیسا ہے وغیرہ۔ سبھی ٹھیک کہہ رہے تھے، لیکن ہر ایک حقیقت کو ایک خاص زاویے سے دیکھ رہا تھا اور اسے اپنی نظر کے مطابق ناقص مثالوں کی صورت میں بیان کر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح ہم بھی ان نابینا افراد کی طرح حق کو جس طرح سے ہے، نہیں پہچان سکتے، بلکہ جیسے ہم پر ظاہر ہوتا ہے پہچانتے ہیں۔ لہٰذا ہماری ہر شناخت درست اور صادق ہے۔

دینی کثرتیّت کے بنیادی اصول

دینی کثرتیّت کے دفاع اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں جس دانشور نے سب سے زیادہ کردار ادا کیا وہ جان ہک ہے۔ ایک پروٹسٹنٹ فرقہ سے وابستہ اِس متکلم نے لبرل ازم سے متاثر ہو کر دینی کثرتیّت کو پیش کیا۔ اس کے نکتہ نگاہ میں دینی کثرتیّت کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

1. ہر شخص ہر عقیدے کی بنیاد پر جنت جاسکتا ہے؛ اس شرط پر کہ کسی ایک دین کے ذریعے حق کی طرف توجہ کرے؛ کیونکہ ہر دین میں حقیقت کا کچھ نہ کچھ حصہ موجود ہے۔
2. نجات سے مراد توجہ کو خود سے ہٹا کر حق کی طرف مبذول کرنا ہے۔
3. دین کا جوہر، دینی تجربہ اور حق سے متعلق شخصی احساس ہے۔ دوسرے الفاظ میں دین کا جوہر، حق کی طرف توجہ ہے؛ لہذا اعتقادات، ایمان، مذہبی اعمال اور عبادات دین میں ذیلی اور ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔
4. چونکہ دین کا جوہر، دینی تجربہ اور شخصی احساس ہے، دینی ایمان کو معقول انداز میں پیش کرنے کے لیئے دینی تجربے سے مدد لینے کی ضرورت ہے نہ کہ عقل اور عقلی دلائل سے۔
5. برحق دین یا صراط مستقیم ایک خیالی امر ہے؛ تمام ادیان حق ہیں اور ازلی حقیقت تک راہنمائی کرتے ہیں۔ لہذا مسیحیت یا کسی بھی دین کی برتری کے لیئے عقلی استدلال مشکوک ہیں۔
6. انجیل کی بعض تعلیمات اور کچھ اعتقادی مسائل رمزیہ ہیں۔ لہذا تجسم اور نظریہ نجات کی نئی تفسیر پیش کرنی چاہیے۔
7. لبرل ازم کے اخلاقی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے تعصب چھوڑ کر دوسروں کو تحمل کرنا چاہیئے۔ لہذا ادیان کے متشدد احکام اور ان کے پیروکاروں کے انتہا پسندانہ رویوں کو رد کرتے ہوئے شریعت کے نفاذ سے پرہیز کرنا چاہیے۔

دینی کثرتیت کے حامیوں کی مشکل

یہاں دینی کثرتیّت کے حامی خود کو ایک سخت مشکل سے روبرو پاتے ہیں اور وہ یہ کہ: کیونکر مختلف ادیان اور مکاتب کے حق ہونے کے بارے میں پیش کئے گئے تمام نظریات کو سچا مانا جاسکتا ہے، حالانکہ ان نظریت کی بڑی تعداد آپس میں تضاد رکھتی ہے اور سب ایک ساتھ صحیح نہیں ہو سکتے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو دو خداؤں کے قائل ہیں ان کی بات بھی درست ہو اور عین اسی وقت تثلیث کا عقیدہ بھی برحق

ہو۔ نیز وہ لوگ بھی حق پر ہوں جو توحید اور خداوند یکتا ہونے کے معتقد ہیں؟ خلاصہ یہ کہ کیونکر متضاد عقائد اور متناقض نظریات کو ایک ساتھ صحیح قرار دیا جاسکتا ہے؟

ہک نے اس علمیاتی یا معرفتی مشکل کے حل کے لئے کانٹ کے نظریہ علم سے مدد لیتے ہوئے "حقیقت" (Noumenon) (5) اور "ظہور" (Phenomenon) (6) کے درمیان فرق کو بنیاد بنایا۔ کانٹ کے نقطہ نظر کی رو سے اشیاء کی حقیقت اور اصل ماہیت ناقابل دسترس اور ناقابل شناخت ہے۔ لہٰذا ہر شخص حقیقت کو ویسا درک کرتا ہے جس طرح وہ اُس پر ظاہر ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر مکتب کے پیرو، حق کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں جیسے وہ ان پر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بظاہر متصادم اور متناقض تفسیریں، ایک ہی حقیقت کے مختلف بیان ہیں۔ ہر کوئی اپنے زاویہ نگاہ اور فہم کی بنیاد پر حق کو درک کرتا ہے۔ لہٰذا آپس کے تضاد اور تناقض کے باوجود سبھی درست ہیں۔

دینی کثرتیت کا تنقیدی جائزہ

1. دینی کثرتیّت کے نظریے کا لازمہ یا "ارتیابیّت" (Scepticism) یا "اضافیّت" (Relativism) ہے۔ کیونکہ اس کی رو سے حقیقت بذات خود ناقابل دسترسی ہے۔ علم وآگاہی ظہور اور نمود کے تابع ہے، نہ کہ واقعیّت اور حقیقت کے تابع۔ لہٰذا ہر مکتب برحق ہے اور وہ حق کی بالذات حقیقت کو نہیں پہچان سکتا بلکہ اس نے حق کو اس طرح پہچانا ہے جس طرح اس پر ظاہر ہوا ہے۔ یوں حق سے آگاہی کا راستہ انسان پر مسدود ہے۔ انسان علمی محدودیتوں اور مشکلات کی وجہ سے نہ تو حق کو پہچان سکتا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ جان سکتا ہے۔
2. ہک نے کانٹ سے ماخوذہ، نومن اور فنومن کے فرق کی جس بنیاد پر ادیان کے تناقضات اور تضادات کو حل کرنے کی کوشش کی ہے، وہ بنیاد ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ انسان اپنے حصول علم کے ذرائع سے واقع اور حقیقت کو پہچان سکتا ہے۔ کیونکہ علم دو طرح کا ہے: ۱) حضوری علم، ۲) حصولی علم۔ حضوری علم میں، جہاں علم کا حصول ذہنی مفاہیم کے واسطے کے بغیر ہے، معلوم، عالم (مُدرِک) کے پاس حاضر ہوتا ہے۔ لہٰذا مُدرِک اس قسم کی آگاہی میں خود حقیقت اور واقع کو پالیتا ہے۔ بدقسمتی سے مغربی فلسفی مکاتب میں اس قسم کے علم سے غفلت برتی گئی ہے۔

جہاں تک حصولی علم کا تعلق ہے تو اس میں، قضیے، جو اس کی ایک قسم ہیں، دو بنیادی اقسام میں تقسیم ہوتے ہیں؛ بدیہی اور نظری۔ نظری قضیوں کا صدق اور حقیقت سے ان کی مطابقت، ان کے بدیہی قضیوں کی طرف پلٹائے جانے سے روشن ہو جاتی ہے، اور بدیہی قضیوں، جیسے وجدانیات، بدیہیات اولیہ اور منطق کے بدیہی قوانین، کا صدق ان کے حضوری علم، جس میں کوئی واسطہ حائل نہیں ہوتا، کی طرف پلٹانے سے واضح ہو جاتا ہے۔ پس ہم حقائق اور نومن کو ایسے نظری اور بدیہی قضیوں سے پہچانتے ہیں، نہ فنومن اور ظہور کے ذریعے۔(7)

3. ہک کے لئے کانٹ کی فراہم کردہ بنیاد بذات خود ایک "خود متضاد" (Self-contradictory) نظریہ ہے۔ یہ نظریہ خود اپنی نفی کرتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ مان لیا جائے کہ "حقیقت" اور "ظہور" میں فرق پایا جاتا ہے تو پس خود کانٹ پر جو کچھ اس نظریہ کی صورت میں ظاہر ہوا ہے، وہ حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ پس کانٹ کا نظریہ حقیقی نہیں، بلکہ ایک ایسا امر ہے جو اس پر ظاہر ہوا ہے اور اس کا فنومن ہے۔اس کے علاوہ، یہ بھی کہا جاسکتا ہے: اگر انسان پر ہمیشہ نومن ہی ظہور کرتا ہے تو مسٹر کانٹ کو کیسے معلوم ہوا کہ کوئی حقیقت بھی پائی جاتی ہے اور حقیقت اور ظہور میں فرق پایا جاتا ہے؟ بالخصوص جب کانٹ کا دعوی یہ ہو کہ حقائق کو درک کرنے کا راستہ ہی مسدود ہے؟

4. اوپر بیان شدہ دینی کثرتیت کی بنیاد پر تمام ادیان اور مکاتب حتی کمیونزم جیسے مکاتب فکر بھی برحق ہیں اور ازلی حقیقت تک پہنچاتے ہیں۔ دین برحق یا صراط مستقیم موہوم امر سے زیادہ کچھ نہیں اور کسی مکتب کو کسی دوسرے مکتب پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔اس بات کا لازمہ یہ ہے کہ ہر موہوم یا خرافاتی امر، حتی شیطان پرستی، انسان پرستی(8) اور بت پرستی، حق کی طرف جانے کا راستہ اور خود محوری سے نکل کر خدا محوری تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔

جان ہک کی بے سود تگ ودَو

جان ہک نے مذکورہ مشکل کے حل کے لئے تین معیار پیش کیے ہیں:

1) **تجربی معیار**: تجربی معیار سے مراد یہ ہے کہ ایک دینی معاشرہ کسی مشترکہ دینی تجربے کی تائید کرے اور ایک مشترکہ دینی تجربے کا حامل ہو۔ یوں یہ معیار، دین کو دینی تجربے کی حد تک گرا کر دین کی حقیقت اور جوہر کو صرف ذاتی تجربے کے طور پر پیش کرتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معیار سے استدلال اور حقانیت کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اگر دین سے مراد ذاتی اور باطنی احساس ہو تو صادق کو کاذب اور حق کو باطل سے پہچاننے کا کوئی راستہ ہی باقی نہ بچے گا۔ اسی طرح ایک دین کو دوسرے دین پر ترجیح بھی نہ دی جاسکے گی۔ مزید برآں، اگر معتبر ہونے کا معیار ذاتی تجربہ اور باطنی احساس ہو تو بت پرستی، شیطان پرستی اور انسان پرستی جیسے خرافاتی اور موہوم مکاتب جو ایسے ہی احساسات کی بنیاد پر استوار ہیں، انہیں مسترد کرنے کی کوئی دلیل باقی نہیں رہے گی۔

2) اندرونی انسجام کا معیار: اگر اندرونی انسجام کے معیار کو معتبر فرض کر لیا جائے تو اس کے ذریعے ایک عقیدے کا صرف کسی خاص مذہبی نظام کے اندر رہ کر ہی مطالعہ کیا جاسکتا ہے اور یہ پرکھا جاسکتا ہے کہ وہ عقیدہ اس خاص مذہبی نظام کے ساتھ سازگار ہے یا نہیں؟ لیکن یہ جاننے کے لئے کہ کوئی مکتب یا مذہب موہوم یا خرافات پر مبنی ہے اور حق تک پہنچنے کا ذریعہ نہیں بن سکتا، مذکورہ معیار مفید واقع نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ یہ معیار کئی دوسری اساسی مشکلات کا شکار ہے جن کے بیان کی یہاں گنجایش نہیں۔

3) اخلاقی معیار: جان ہک کی گفتگو سے ایک اور معیار بھی ہاتھ آتا ہے جو اخلاقی معیار ہے۔ لیکن اس معیار کے بارے میں بھی یہ سوال اٹھتا ہے کہ کسوٹی کے طور پر کس کا اخلاقی معیار انتخاب کیا جائے؟ کیا آپ کے اخلاقی معیار کو بنیاد بنایا جائے؟ اگر ہاں، تو سوال یہ ہے کہ آپ کا اخلاقی معیار کس دلیل کی بنا پر معتبر ہے اور دوسرے آپ کے اخلاقی معیار کے تابع کیوں ہوں؟ اگر ہر مکتب کا اخلاقی معیار صرف اسی مکتب کے پیروکاروں کے لیے معتبر ہو تو کس طرح اس کے ذریعے دوسرے مکاتب کے بارے میں فیصلہ کیا جاسکتا ہے؟

دینی کثرتیّت پر چند دیگر اشکال

1. ایمان پر حد سے زیادہ تاکید کے سبب دین کے دوسرے پہلو یعنی عمل اور شریعت سے غفلت برتی گئی ہے۔ جس طرح دین میں اعتقادات اور ان پر ایمان سے چشم پوشی ممکن نہیں، اسی طرح عمل اور شریعت کے پہلو سے بھی بے توجہی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ عمل بھی دین کے تحقق میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ دین تین حصوں اعتقادات، احکام اور اخلاق پر مشتمل ہے۔ اخلاق اور احکام کا تعلق دین کے عملی پہلو سے ہے۔ اعتقادی پہلو میں بھی صرف باطنی تجربے، جو ذاتی احساس ہے، پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا بلکہ اپنے اور اپنے آغاز سے متعلق افکار کی نوعیت کو کسی معتبر معیار کے ذریعے پرکھنا اور ان کا جائزہ لینا چاہیے۔ دینی اعتقادات کے دائرے میں عقل اور عقلی استدلال،

عقائد کو ثابت اور خرافات کی نفی کرنے میں اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں۔ بہر حال یہ نقطہ نظر ادیان کے درمیان تضاد کو دور کرنے میں ان کے بنیادی حصوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

2. یہ نقطہ نظر ادیان کے درمیان تضاد کو دور کرنے میں نہ صرف ان کے عملی اور اخلاقی احکام کے ایک بڑے حصے سے چشم پوشی کرتا ہے بلکہ ان کے اعتقادی اور ایمانی پہلو میں بھی خاص اعتقادات کو چن کر باقی کو نظر انداز یا مسترد کر دیتا ہے، جبکہ اعتقادات کا ایک بہت بڑا حصہ دین کے تحقق میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے اور انہیں نظر انداز کرنا، اس دین کو ترک کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ جیسے تحریف شدہ مسیحیّت میں تثلیث اور تجسم کا عقیدہ یا نجات کا عقیدہ اور یہ عقیدہ کہ انسان خدا کے بیٹے، حضرت عیسیٰؑ کی کفارے کی خاطر موت کی وجہ سے نجات پائیں گے۔ اگرچہ جان ہک خدا کے تجسم سے متعلق روایتی نکتہ نگاہ کی نفی کرتے ہوئے تجلی سے مشابہ نظر اختیار کرتا ہے، تاہم روایتی مسیحی اس تاویل کو نہ صرف قبول نہیں کرتے بلکہ ان تعلیمات پر ایمان کو مسیحیّت کی بنیاد مانتے ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق حتی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ بھی جنت میں داخل نہ ہو پائیں گے کیونکہ زمانے کی دوری کی وجہ سے وہ نجات کے عقیدے اور حضرت عیسیٰؑ کی ربوبیت اور ان کی کفارے کی خاطر موت پر ایمان نہیں رکھتے تھے (9)۔

3. جہاں تک مولانا رومی کی تمثیل کا تعلق ہے تو اس حوالے سے یہ کہنا چاہیے کہ اس تمثیل میں بیان شدہ کسی ایک بھی نابینا شخص کی بات صحیح نہ تھی۔ کیونکہ جسے وہ لمس کر رہے تھے ہاتھی کی ٹانگ، کان اور اس کی سونڈھ تھی، نہ کہ ستون، دستی پنکھا یا اژدہا۔ یہ دعوی کہ ان میں سے ہر ایک نے ہاتھی کو ایک خاص زاویے سے یوں درک کیا تھا، ایک غلط دعوی ہے۔ جو کچھ انہوں نے لمس کیا تھا اس کے بارے میں کسی کی بات بھی ہاتھی کو بیان نہیں کر رہی تھی بلکہ کسی دوسری شے جیسے اژدہا، ستون یا پنکھے کو بیان کر رہی تھی۔ لہٰذا ان سب کی باتیں غلط تھیں۔ انہوں نے واقعاً ہاتھی کی سونڈھ کو لمس کیا تھا نہ اژدہا کو، اس کی ٹانگوں کو لمس کیا تھا نہ ستون کو ...

4. دراصل، مولانا رومی ہاتھی کی تمثیل سے جو بات سمجھانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان، حق کو پانے کے لئے آگاہی کے عام وسائل سے بالاتر کسی وسیلے کا محتاج ہے۔ ایسے ہی جیسے قوت لامسہ بینائی کا عمل انجام نہیں دیتی، اسی طرح عام بشری وسائل اور راستوں کے ذریعے حق تعالیٰ تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ انسان

کو چاہیے کہ وہ حق کی پہچان کے لئے نور الٰہی کا سہارا لے۔ اس علم کا حصول آگاہی کے رائج طریقوں کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ درج ذیل ابیات میں اس مطلب کی وضاحت پیش کی ہے:

در کف ھر کس اگر شمعی بدی　　اختلاف از گفتشان بیرون شدی

...

چشم دریا دیگر ست و کف دگر　　کف بھل وز دیدہ دریا نگر

یعنی: "اگر اندھیرے میں ہاتھی کا مشاہدہ کرنے والے ہر شخص کے ہاتھ میں ایک قندیل تھما دی جاتی تو ہر گز ہاتھی کی تعریف میں وہ اختلاف نہ کرتے۔ ہماری ظاہر کی آنکھ کا حال، لامسہ سے مختلف نہیں ہے۔ اور ظاہر بین آنکھ کہاں تمام حقیقت کا ادراک کر سکتی ہے! بہتے سمندر کی جھاگ ایک چیز ہے۔ لہٰذا اگر سمندر کی حقیقت تو دیکھنا ہے تو اس کے لئے ایک اور نگاہ (چشم باطن) اپنے اندر پیدا کر!" (10)

اشعار کی بیان شدہ تشریح اور تعبیر مذکورہ بالا میں واضح ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تعبیر جان ہک کے دعوے سے بہت مختلف ہے۔

نتیجہ گیری

"دینی کثرتیت" کا نظریہ، ایک ناقابل قبول نظریہ ہے۔ اس نظریے کا پس منظر عہد وسطی میں کلیسا کے مظالم، دہشت گردی اور غیر انسانی رویہ ہیں۔ یہ نظریہ، دین کی حقیقت کو ذاتی ایمان اور احساس میں منحصر سمجھتا ہے۔ اور ان بنیادی عقائد، اخلاق، عبادات، رسوم اور اخلاقی و شرعی احکام کو نظر انداز کرتا ہے جو دین کا جزو لازم قرار پاتے ہیں۔ یہ ادیان کو بگاڑ کر پیش کرتا ہے اور خود یہ نظریہ "ارتیابیت" اور "اضافیت" پر ختم ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو اپنے اپنے معاشرے میں اس طرح کے نظریات کے پرچار کو لمحۂ فکریہ سمجھنا چاہیے اور ان کا علمی جواب آمادہ رکھنا چاہیے۔ آخر میں ہم اپنے قارئین کی توجہ اس طرف مبذول کروائیں گے کہ اس موضوع پر مزید معلومات کے حصول کے لئے اور اس بحث کو صحیح طور سے ذہن نشین کرنے کے لئے درج ذیل امور پر تحقیق جاری رکھیں:

۱۔ دینی کثرتیت کی پیدائش میں اہم ترین عوامل، دینی اور سیاسی لبرل ازم اور دینی کثرتیت کے حامیوں کا ان سے متاثر ہونا ہے۔ دینی اور سیاسی لبرل ازم جیسے نظریات کا جائزہ لیں اور ان کی خصوصیات کا مطالعہ کریں۔

۲۔ نجات کے نظریے پر کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کا اختلاف نظر کیا ہے؟

۳۔ جان ہک نے دینی کثرتیت کی پیش کردہ تعبیر میں تجدید نظر کی ہے۔ ان کی جدید نگاہ کا نقادانہ جائزہ لیں۔
۴۔ دینی کثرتیت کا منشا مسیحی علم کلام ہے۔ اس نظریے کا تاریخی پس منظر کیا مشرقی سرزمین کے مسلمانوں اور عیسائیوں میں بھی پایا جاتا ہے؟
۵۔ یہ دیکھا جائے کہ دینی کثرتیت کے مبانی جیسے دین کو ذاتی احساس اور مذہبی تجربے تک گرا دینا، دین کی زبان کو علامتی قرار دینا اور عقل کو غیر مفید سمجھنا کس قدر غیر منطقی اور باطل نظریات ہیں۔

حوالہ جات

1 ۔ کثرتیت (Pluralism) کا لغوی معنی کثرت کی طرف رجحان ہے اور اصطلاح کے لحاظ سے مغربی ممالک میں اس کے سیاست، فلسفہ اخلاق، فلسفہ دین، ہنر وغیرہ میں مختلف معانی ہیں۔

2۔ الحجر: ۹

3 ۔ سورہ بقرہ، آیات ۱۱۱، ۱۱۳۔

4 ۔ جلال الدین محمد بلخی، مثنوی معنوی، دفتر سوم، ۱۲۶۹-۷۹۔

5 -Noumenon : (in Kantian philosophy) a thing as it is in itself, as distinct from a thing as it is knowable by the senses through phenomenal attributes.

6۔ *Phenomenon:* the object of a person's perception; what the senses or the mind notice.

7۔ اس بحث کی تفصیل جاننے کے لئے دیکھیے:

An Introduction to Epistemology and Foundations of Religious Knowledge by Mohammad Hussain Zade.

8 ۔ فرانسیسی مفکر اگسٹ کامٹ نے "انسانیت" کے نام سے ایک مذہب کی بنیاد رکھی جس کا معبود "انسان" تھا اور وہ خود اس کا پیغمبر تھا۔ اس نے انسان کی عبادت کے لئے عبادت گاہیں بھی بنوائیں۔

9 ۔ اسی کے ساتھ، مسیحی اس بات کے بھی معتقد ہیں کہ قیامت کے دن حضرت عیسیٰ انہیں لیمبو سے نجات دلائیں گے۔

10 ۔ جلال الدین بلخی، مثنوی معنوی، دفتر سوم، بیت ۱۲۸۱-۱۲۷۸

1. ہیک، جان، فلسفہ دین، ترجمہ بھرام راد، تہران، ھدی، ۱۹۹۴
2. ہیک، جان، مباحث پلورالیسم دینی، ترجمہ عبدالرحیم گواھی، تہران، تبیان، ۱۹۹۹
3. ناس، جان، تاریخ جامع ادیان، ترجمہ علی اصغر حکمت، تہران، سازمان انتشارات وآموزش انقلاب اسلامی، ۱۹۹۱
4. لگنھاوسن، محمد، اسلام و کثرت گرایی دینی، ترجمہ نرجس جواندل، قم، طہ، ۲۰۰۰
5. حسین زادہ، محمد، درآمدی بر معرفت شناسی و مبانی معرفت دینی، انتشارات موسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینی ؒ، قم، ۲۰۱۳

*****

اتحاد کی اہمیت اور تفرقہ کے نقصانات

(قرآن وسنت کی روشنی میں)

غلام محمد *

ghulammuhammadphd@gmail.com

کلیدی کلمات: اتحاد، تفرقہ، نقصانات، اللہ کی رسی، اتحاد بین المسلمین۔

خلاصہ

قرآن وسنّت میں مسلمانوں کو اتحاد کا حکم دیا گیا ہے اور تفرقے سے دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اتحاد بین المسلمین کا مفہوم مسلم قوموں کا باہمی تعاون، آپس میں ٹکراؤ و تنازعے سے گریز اور عالم اسلام کے مسائل کے سلسلے میں ایک ساتھ حرکت کرنا، اپنے سرمایہ دولت کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال نہ کرنا اور دشمن کے مقابلے میں آپس میں ہم خیالی اور ہمدلی برقرار رکھنا ہے۔

قرآن کریم میں مسلمانوں کی وحدت کا راز "حبل اللہ" یا اللہ کی رسی کو تھامے رکھنا کو قرار دیا گیا ہے۔ اور اللہ کی رسی سے مراد، قرآن کریم لی گئی ہے۔ گویا قرآن کریم مسلمانوں کے درمیان نقطہ اشتراک ہے اور قرآنی مسلمات کو بنیاد بنا کر مسلم امت آپس میں اتحاد و اتفاق سے زندگی گزار سکتی ہے۔ یہی وہ رشتہ ہے جس سے منسلک ہو کر مسلمانوں انتشار سے بچ سکتے ہیں۔ اگر مسلمانوں میں اتحاد ہو تو اللہ کا ہاتھ جماعت اور متحد لوگوں کے سروں پر ہوتا ہے۔ زیر نظر مقالہ میں اتحاد بین المسلمین کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

*۔ ریسرچ اسکالر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

قرآن کریم کی متعدد آیات اور رسول اکرم کی احادیث میں مسلمانوں کو متحد رہنے کا حکم دیا گیا ہے اور انہیں اختلافات و تفرقے سے دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: "تم سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور پراکندہ نہ ہو۔" (1) اس آیتِ کریمہ میں اللہ کی رسی کو مل کر مضبوطی سے تھامنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ خطاب کسی فرد واحد سے نہیں، بلکہ ساری امت سے ہے۔ لہٰذا اتحاد بین المسلمین مسلمانوں کا اجتماعی فریضہ ہے۔

اتحاد کا مفہوم:

الف: لغوی مفہوم: لفظ اتحاد باب افتعال کا مصدر ہے۔ "اِتَّحَدَ الشَّیْئَان" یعنی دو چیزوں کا ایک ہو نا۔ اِتَّحَدَ الشیئُ بالشیئِ ایک چیز کا دوسری چیز سے ملنا اور جڑنا، اتحد القوم، لوگوں کا متفق ہو نا۔ (2) نیز اتحاد، اتحد کا مصدر ہے، جس کے معنی ایک ہو نا، ایک ہی جیسا، یکدلی، یک جہتی، موافقت، ہے۔ (3) صاحب فرہنگ معینؔ، وحدت اور اتحاد کی تعریف میں فرماتے ہیں: لغت میں وحدت کے معنی ایک ہو نا، ایک رہنا، ایک مقصد و مذہب میں ایک گروہ کا اشتراک، مجموعی مقاصد و آمال میں تمام افراد قوم کا اشتراک۔ (4) اہل لغت حضرات اتحاد کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "والاتحاد صیرورۃ الشئین شیئاً واحداً من غیر زیادۃ و لانقصان" یعنی: اتحاد یہ ہے کہ چند چیزیں اپنی ذاتی خصوصیات کو محفوظ رکھتے ہوئے (بغیر کمی و زیادتی کے) آپس میں ایک ہو جائیں۔ (5)

ب۔ اصطلاحی مفہوم:

اصطلاح میں اتحاد کا معنی ہے کہ چند چیزیں اپنی ذات خاصیت کو محفوظ رکھتے ہوئے آپس میں ایک ہو جائیں۔ (6) علامہ حلی اتحاد کے معنی اصطلاحی کو یوں بیان فرماتے ہیں: "اختلاف سے پرہیز اور مشترکات مذاہب کو لینا اور دشمنان اسلام کے مقابلے میں اکٹھا ہو نا۔"

آپ اتحاد کی دو صورتیں بیان فرماتے ہیں:

ا) **حقیقی اتحاد**: دو چیزوں کا ایک میں تبدیل ہو نا۔ (اگرچہ دو چیزوں کے درمیان ایسا اتحاد عالمِ خارج میں محال ہے) ۲) **مجازی اتحاد**: اس کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک شئی، دوسری شیئ میں ضم ہو جائے؛ جیسے پانی، مٹی

کی ملاوٹ سے کیچڑ بنتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بغیر ملائے ایک شئی کا دوسری شئی کی صورت اختیار کرنا، جیسے آگ، پانی کو بھاپ میں تبدیل کر دیتی ہے۔(7)

صاحبِ المعجم الوسیط فرماتے ہیں کہ وحدت ملت، امت، شہریوں اور ملکی لوگوں کا آپس میں اجتماعی صورت میں مربوط ہونا۔(8) لفظ اتحاد وحدت دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا ایک (یکجا) ہونے میں استعمال ہوتا ہے۔(9) اصطلاح میں اتحاد کی تعریف لغوی معانی (یگانگت، باہمی موافقت، اتفاق، میل جول) کو پیش نظر رکھتے ہوئے یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ آپس کے مفاد اور اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے ہمدل و متحد اور ایک ہونا۔(10) پس اتحاد و وحدت کے مفہوم لغوی و اصطلاحی کو غور سے مطالعہ کر لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد مسلم قوموں کا باہمی تعاون، آپس میں ٹکراؤ و تنازعے سے گریز، ایک دوسرے پر ظالمانہ انداز میں تسلط قائم کرنے سے گریز کرنا ہے۔ نیز عالم اسلام کے متعلق مسائل کے سلسلے میں ایک ساتھ حرکت کرنا، اپنے سرمایہ دولت کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال نہ کرنا اور دشمن کے مقابلے میں آپس میں ہم خیالی اور ہمدلی برقرار رکھنا اتحاد بین المسلمین ہے۔

اتحاد بین المسلمین:

روز ازل سے اللہ نے انسان کی ہدایت اور رہنمائی کا انتظام کیا اور اس امر میں اتنی جدیت اور دقت سے کام لیا گیا ہے کہ حتی قبل اس کے کہ انسان کو زیور وجود سے آراستہ کیا جائے اور انہیں زمین میں بسایا جائے ان کی ہدایت کا انتظام کیا اور حضرت آدمؑ کو پہلا انسان اور اولین خلیفہ (اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً) (11) اور ہادی بنا کر بھیجا تاکہ انسان ایک لمحہ کے لئے بھی بغیر رہنماء کے زندگی نہ گزارے اور سرگرداں اور متحیر نہ رہے اور جیسے جیسے انسان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، بستیاں بستی رہیں اور شہر آباد ہوتے گئے۔ بیابان آبادیوں میں تبدیل ہوتے رہے، ہدایت کے انتظامات بھی وسیع ہوتے رہے اور انبیاء و مرسلین، کتابوں اور صحیفوں کا سلسلہ بھی آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک ہی وقت میں چند انبیاء مختلف جگہوں پر سلسلہ ہدایت کو آگے بڑھانے کے لئے بھیجے گئے تاکہ تشنہ ہدایت انسانیت سیراب ہوسکے اور ان کی سیرت پر عمل کرکے دنیا و آخرت کی سعادتیں حاصل کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ روئے زمین پر ایک مکلّف مخلوق امتحان و آزمائش کے لئے بھیجی جائے تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ "احسن عملاً" کا امتیازی نشان کون حاصل کرتا ہے۔

پھر حکمت و رحمت الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ اس مخلوق کے بسنے سے پہلے اس کی ہدایت و رہنمائی کا انتظام ہو جائے۔ خداوند متعال نے اس سلسلہ ہدایت کو بلندی و کمال تک پہنچانے کے لئے اپنے حبیب حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا اور حکم دیا کہ: ''وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (12)'' یعنی: "جو تمہیں رسول دے دیں وہ لے لو اور جس سے روک دیں، اس سے رک جاؤ!" چنانچہ ان کے لائے ہوئے دین اور شریعت کی تکمیل کے بعد حکم دیا کہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا یعنی: "اے ایمان والو! اللہ سے اس طرح ڈرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو اور اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔" (13)

اس آیت کریمہ میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے بیک وقت چار چیزوں کا حکم دیا ہے۔ تقویٰ الٰہی اختیار کرنا، حالت اسلام اور تسلیم کی زندگی گزارنا، حبل اللہ سے تمسک اور تفرقہ سے بچنا، ایک معاشرے میں زندگی گزارنے کے لئے یہ چار سنہرے اصول ہیں۔ آیت کریمہ میں ''وَاعْتَصِمُوْا'' فعل امر جمع کا صیغہ ہے۔ باب افتعال سے، اعتصام مصدر ہے۔ یعنی اتحاد اور اعتصام دونوں کا تعلق باب افتعال سے ہے۔ حبل اللہ کو تھامنے کی صورت میں اتحاد ہوگا اور واعتصموا فعل امر وجوب پر دلالت کرتا ہے جس طرح وَلَا تَفَرَّقُوْا فعل نہی ہے اور حرمت پر دلالت کرتا ہے۔ پس اتحاد بین المسلمین واجب ہے، تفرقہ واختلاف حرام ہے۔

حبل اللہ سے مراد:

ابو سعید الخدری نے رسول اللہ سے روایت نقل کی ہے کہ حبل اللہ سے مراد کتاب اللہ (قرآن) اور ابن مسعود، قتادہ، والسدی و ابن زید نے ''دین اسلام'' مراد لیا ہے اور ابن مسعود نے مزید کہا ہے کہ: ولا تفرقوا یعنی ولا تتفرقوا عن دین اللہ الذی امر فیہ بلزوم الجماعۃ والائتلاف علی الطاعۃ (14)

صاحب مجمع البیان نے حبل اللہ کے بارے میں تین اقوال تحریر کیے ہیں: ۱۔ابی سعید الخدری، عبداللہ و قتادۃ، والسدی نے روایت کی ہے کہ حبل اللہ سے مراد القرآن ہے، ۲۔ابن عباس، ابی زید کے نزدیک دین اللہ الاسلام

اور ابان بن تغلب نے جعفر ابن محمد سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: نحن حبل اللہ(15) یعنی: "ہم اللہ کی رسی ہیں۔" بعض مفسرین اللہ کی رسی سے مراد خدا کی آیات اور رسولِ خدا سے تمسک لیتے ہیں کیونکہ قرآن اور رسول خدا کی ہدایت ہی خدا تک پہنچاتی ہے۔

نیز صاحب المیزان بالاعتصام حبل اللہ سے مراد لیتے ہوئے فرماتے ہیں: "ھوالکتاب المنزل من عنداللہ وھویصل مابین العبد والرب ویربط السماء بالارض وان شئت قلت ان حبل اللہ ھوالقرآن والنبی" حبل اللہ وہ کتاب ہے جسے اللہ نے نازل فرمایااور یہ عبد کارب سے تعلق قائم کرتا ہے اور اگر چاہو تو کہو بیشک حبل اللہ سے مراد قرآن و نبی ہے۔(16)۔ صاحب بُردۃُالمدیح کا نظریہ بھی یہی ہے کہ حبل اللہ سے مراد، قرآن و نبی ہے جیسا کہ وہ کہتے ہیں: قَرَّتْ بِهَا عَيْنُ قَارِيهَا فَقُلْتُ لَهُ لَقَدْ ظَفِرتَ بِحَبْلِ اللهِ فَاْعْتَصِمْ(17) قرآن پڑھنے والے کی آنکھوں کو نور اور دل کو سرور ملتا ہے تو میں نے کہا اے قاری تو نے اللہ کی رسی کو پالیا اور اسے مضبوطی سے پکڑے رہے۔ مزید کہتے ہیں: دَعَا اِلَى اللهِ فَالْمُسْتَمْسِكُوْنَ بِهِ مُسْتَمْسِكُوْنَ بِحِبْلٍ غَيْرِ مُنْفَصِمٍ(18) یعنی انہوں (رسولؐ) نے لوگوں کو اللہ کی جانب بلایا پس جن لوگوں نے انہیں مضبوط پکڑا انہوں نے ایسی رسی کو مضبوطی سے پکڑا جو ٹوٹنے والی نہیں ہے۔

علی اکبر ہاشمی رفسنجانی اپنی تفسیر راہنما میں فرماتے ہیں کہ "حبل اللہ" (اللہ کی رسی سے مراد) کتاب وسنت ہے جو کہ اہل ایمان کی صفوں کے درمیان اتحاد کا وسیلہ ہے اور مزید فرماتے ہیں کہ سورہ آل عمران آیت ۱۰۳، ۱۰۲ کی شان نزول آیت تفرقہ اور نزاع سے پرہیز کرنا ہے۔(19) خلاصہ بحث یہ ہے کہ اللہ کی رسی کو تھامنے کے معنی ہیں کہ سب کا اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ نظام پر قائم و دائم رہنا ہے۔ اسی نظام کا نام دین ہے اور اسی نظام کا دستورالعمل قرآن ہے اور اسی نظام کے رہبر و عملی نمونہ حضرت محمد ﷺ ہیں۔ پس اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے سے ہی ہم اپنے افکار و عقائد کا بخوبی دفاع کر سکتے ہیں۔

مختلف تفاسیر کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے بہت ساری آیات بالاخص سورہ آل عمران کی آیت ۱۰۳ صریحاً لوگوں کو اتحاد بین المسلمین کی دعوت دے رہی ہے اور ہر طرح کے تفرقہ سے روک رہی ہے۔ قرآن کا دعوت اتحاد دینا یقینا بجا ہے کیونکہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تمام اسلامی فرقوں (مسلکوں) کے درمیان بنیادی و اعتقادی قدر مشترک ہیں۔ اسلامی عقائد کا سارا نظام انہیں مشترک

بنیادوں پر استوار ہے۔ مسلمانوں میں سے کوئی بھی نہ تو کسی اور نبی یا رسول کی شریعت کا انکار کرتا ہے اور نہ ہی اسلام کے سوا کسی اور دین کو مانتا ہے۔ سب مسلمان توحید و رسالت، وحی اور کتب سماوی کے نزول، آخرت کے انعقاد، ملائکہ کے وجود، حضور کی خاتمیت، اہلبیت عظام، صحابہ کرام پر ایمان، نماز، روزہ، حج، زکوۃ، خمس کی فرضیت، قرآن کریم، قبلہ واحد، بنیادی منابع کے طور پر قرآن و سنت نبوی پر اعتقاد، دفاع از اُمت مسلمہ، اسلامی سرزمینوں کا دفاع اور اسلام کی مصلحتوں کو دیگر مصلحتوں پر ترجیح دینا جیسے مسائل مشترک ہیں اور ان کی فرضیت پر سب یکساں ایمان رکھتے ہیں۔

اگر کہیں کوئی اختلاف ہے تو صرف فروعی و جزئی حد تک، پس اس فروعی جزئی اختلاف سے عقائد اسلام کی بنیادوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور جب کوئی اثر بھی نہیں پڑتا تو آخر کیا وجہ ہے کہ ہمارا خدا ایک، رسول ایک، کتاب ایک، کعبہ ایک، حج ایک، جہاد ایک، اس کے علاوہ نکاح بیاہ کے فرائض، جنازے کے متعلقہ مسائل اور بعد دفن نکیر و منکر کی پوچھ گچھ اور اس کے بعد عالم برزخ پھر حشر و نشر یعنی قیامت اور اس کے حساب کتاب، پل صراط، دوزخ جنت سب کو سبھی تسلیم کرتے ہیں۔ مقصد ہمارا سب کچھ ایک ہے مگر فرقہ پرستی کے جوش میں مسلمانوں نے عملاً اسلام کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے اور ثانوی حیثیت دے کر فرقے، مسلک اور مذہب کو اولین حیثیت دے دی ہے۔ جس کی بناء پر مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور یگانگت کے لازوال رشتے قائم نہ کئے جاسکے۔ علامہ اقبال مسلمانوں کی مشترکات کے ضمن میں اتحاد پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک　　ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک　　کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

قرآن و سنّت کی روشنی میں اتحاد کی اہمیّت:

قرآن مجید کی آیات کریمہ میں ایسے لطیف و ظریف مضامین ہیں کہ انسان کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ہر وہ چیز جس سے مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے اور ان کے لئے مایہ سعادت و خوش بختی ہو سکتی ہے اسے بیان کر دیا گیا ہے لیکن مسلمان اس سے غافل ہیں باوجودیکہ ہم قرآن تو پڑھتے ہیں اس کی تفسیر بھی سنتے ہیں۔ قرآن بارہا کہہ رہا ہے کہ مسلمان ایک امت ہیں اور یہ اسلام کی ضروریات میں سے ہے۔ ایک امت کا مطلب یہ ہے کہ اپنے درمیان اتحاد قائم رکھیں۔ اتحاد یہ نہیں کہ سب مسلمان ایک صف میں کھڑے

ہوں بلکہ سب ایک سلسلہ سے متمسک ہوں اور وہ سلسلہ اصل توحید، اصلِ نبوت اور اصلِ معاد ہے اور ہر وہ چیز جو قرآن میں ہے اور جسے رسول لے کر آئے ہیں وہ مشترک جامع اصل، عقیدہ کا اشتراک ہے۔

مشترک جامع اصل سے ہماری مراد اسلام کے وہ قطعی اصول ہیں جن پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے جو کتاب و سنت سے قطعی طور پر ثابت ہیں۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن کے قوانین کی پابندی کرنی چاہیے۔ سیاست، معاملات، احکام قضاوت، قصاص اور دیات میں اجمالی طور پر سبھی متفق ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید مسلسل لوگوں کی ضمیروں کو جھنجھوڑ رہا ہے کہ تم ایک ملت ہو اور تمہارے لئے ایک دین منتخب کیا گیا ہے۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ(20) یعنی: "یہ تمہاری امت، بے شک امتِ واحدہ ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں، لہٰذا میری عبادت کرو۔" ایک اور جگہ ارشاد فرماتا ہے: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ....(21) یعنی: "اس نے تمہارے لئے دین کا عمی دستور معین کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔۔۔"

اس آیت کریمہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو وحدت اور تفرقہ نپ پھیلانے کا حکم عام کرنے کی وصیت فرمائی۔ لیکن لوگوں نے اس ایک پیغام کو اپنی اپنی خواہشات و مفادات کے تحت کچھ بڑھا کر کچھ گھٹا کر مختلف فرقے بنا دیے۔ یہی حال امت اسلام کا ہوا۔ حالانکہ امت اسلامی کے درمیان پائے جانے والے عقیدتی و فقہی تاریخی اختلافات، فتنہ و فساد سب قابل حل ہیں۔ فقط علمی، عقلی اور منطقی بحث و گفتگو کی ضرورت ہے۔ آج ہمارے جزئی اختلافی مسائل دشمنوں کے حملوں کی زد میں نہیں ہیں بلکہ نبوت و قرآن اور مسلمانوں کے اتفاقی مسائل دشمنوں کے حملوں کی زد پر ہیں۔ حالانکہ قرآنی ایات کے مطالعہ سے یوں لگتا ہے کہ قرآن کا موضوع ہی اتحاد و وحدت ہے۔ مسلمانوں کو آپس میں پیکر واحد قرار دیا گیا ہے۔ ایک مسلمان کی غمی یا خوشی پورے عالم اسلام کو غمزدہ و خوشحال بنا دے جس طرح اگر جسم کے کسی عضو میں درد و تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم پریشان رہتا ہے۔

نبی مکرمؐ کا یہ فرمان ہے کہ: من سمع رجلا ینادی یا للمسلمین فلم یجبه فلیس بمسلم(22) یعنی: "اگر کوئی مسلمانوں کو مدد کے لئے پکارے اور وہ لبیک نہ کہے وہ مسلمان نہیں ہے۔ یا جسے مسلمانوں کے امور کی

اصلاح کی فکر نہ ہو وہ مسلمان نہیں ہے۔" یہ حدیث بھی آپؐ سے نقل ہوئی ہے کہ فرمایا: "من اصبح لا یھتم امور المسلمین فلیس بمسلم" (23) آیا ہم کرہ ارض پر بسنے والے مظلوم و ستمدیدہ مسلمانوں کی خبر لیتے ہیں؟ کیا مظلوم مسلمانوں کی چیخ و پکار اور گریہ و بکاء کے پس منظر میں ایک مسلمان کو اپنے مصلح اعظم ﷺ کی کم از کم یہ احادیث بھی یاد نہیں رہتی ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا روئے سخن کیا ہم (مسلمان) نہیں؟ کیا ہم مظلوم مسلمانوں کی دامے درمے قدمے سخنے مدد کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر ہمیں اپنے مسلمان ہونے کے بارے میں سوچنا ہوگا کہ آخر ہم مسلمان ہیں بھی یا نہیں؟ آخر مسلمان قوم کب بیدار ہوگی؟ آج عالم اسلام متحد ہوتا تو مسلمانوں کا قبلہ اول غیروں کے ناپاک پنجوں تلے آخری سانسیں نہ لیتا اور مسلمان متحد ہوتے تو دشمنانِ اسلام قرآن، مساجد اور مقدسات دین و بالاخص ختمی مرتبت کی توہین در کنار سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ مگر افسوس! آج مسلمان باہمی اختلافات اور باہمی نفرت و عداوت میں دور جاہلیت کی یاد تازہ کر رہا ہے اور اسلام کو سرنگوں کرنے کے لئے شیطانی قوتوں نے مسلمانوں کے لبادے میں اپنے آلہ کار سرگرم کئے ہوئے ہیں۔ یہ اسلام دشمنی آغاز اسلام سے ہی دشمنان اسلام یہود و ہنود اور کفار و مشرکین کی زندگی کا مقصد رہی۔ بالخصوص یہودی دشمنی میں پیش پیش رہے ہیں اور اس کے برعکس قرونِ وسطیٰ کے مسلم ممالک میں یہودیوں کو شاذ و نادر ہی قتل و بے دخلی کا سامنا کرنا پڑا انہیں عمومی طور پر مذہب اور کوئی بھی پیشہ اختیار کرنے کی آزادی حاصل تھی (24)۔

آج بھی مسلمانوں کو منتشر کرنے کے درپے ہیں اور ہم مسلمان بقولِ امام خمینی آج بھی ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے اور کھولنے پر الجھ رہے ہیں جبکہ دشمن ہمارے ہاتھ کاٹنے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ ہمیں فرقہ پرستی، نسل پرستی، زبان پرستی اور علاقہ پرستی کو چھوڑ کر قومی یکجہتی اور اتحاد بین المسلمین کا راستہ اپنا کر اسلام و مسلمین کے مشترکہ دشمن کا مقابلہ کرنا ہوگا اور دشمن سے کسی قسم کی مدد حاصل کرنے کے بجائے صرف اور صرف اپنے خدا کے فضل و کرم پر اور اپنے وسائل پر انحصار کرنا ہوگا۔ مسلمانو! آپس میں محبت و شفقت پیدا کرو جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (صحابہ کرام) آپس میں مشفق و مہربان تھے اور کفار پر سخت گیر تھے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُم (25)

پس مفہوم وحدت بس میں یہ نہیں کہ آپس میں دوستی، محبت کو برقرار رکھیں بلکہ عملی طور پر متحد ہو کر قرآن و اسلام اور اس کے اصول سے دفاع کی خاطر دشمن اسلام کے سامنے شمشیر بکف ہو جائیں۔ قرآن و حدیث کے

مطابق وحدت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ وحدت نام ہے اُمت واحدہ اور اسلامی اخوت کا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یداللہ مع الجماعۃ ۔ یعنی: "اللہ کا ہاتھ جماعت اور متحد لوگوں کے سروں پر ہے۔ "یہی روایت حضرت عبداللہ بن عمر سے بھی نقل ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انّ اللہ لایجمع امتی علی ضلالۃ ید اللہ مع الجماعۃ و من شذ شذ الی النار (26) یعنی: "اللہ میری امت کو کبھی گمراہی پر جمع نہیں کرے گا اور گمراہی پر اس لئے جمع نہیں ہوں گے کہ اللہ کی حفاظت کا ہاتھ ہمیشہ جماعت کے اوپر ہوتا ہے۔"

یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اللہ کا ہاتھ ایک ایک بندے پر ہوتا ہے بلکہ فرمایا جماعت (اتحاد) پر ہے۔ جو شخص مسلمانوں کی جماعت سے ایک ایک کرکے الگ ہوگا، اللہ کی حفاظت کا ہاتھ اس کے سر سے اٹھ جائے گا۔ قرآن کو صحیح مفہوم کے ساتھ اور احادیث رسول ﷺ کو بھی مفہوم کے ساتھ پڑھنے مطالعہ کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ مفاہیم قرآن وحدیث پر غور کرنے سے زندگی سنور جائے گی اس لئے میں اس مقالہ میں اتحاد کے سلسلے میں قرآن کی روشنی میں اپنی گوہر گرانقدر تحریر کو اتحاد کی لڑیوں میں پروتا ہوں۔ اس لئے کہ قرآن پہلا محور اتحاد ہے اس کے بعد رسول اکرم ﷺ کی سیرت اور آنحضرت کی تاریخ اور خانہ کعبہ کا حج ہے۔ یہ وہ مخصوص محور ہیں جس طرح اہل کتاب اور اہل قرآن (مسلمان) کے لئے اتحاد کا مرکز محور ذات احدیت ہے۔ پس جس طرح ہمارا پالنے والا ایک ہے، ہمارا خدا ایک ہے، تو چاہیے ہم اہل وحدت بھی ہوں۔

لیکن کیسے؟ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے: "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللہِ جَمِیْعًا" یعنی ہم سب ایک رسی سے جڑے رہیں جو خدا کی رسی ہے۔ بقول سید ابوالاعلیٰ مودودی: اس لئے کہا گیا ہے کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہل ایمان کا تعلق اللہ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔ (27)

اسی طرح سورہ نساء میں اہل ایمان کی صفت یہ ہے کہ: اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللہِ وَاَخْلَصُوْا دِیْنَھُمْ لِلّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ (28) یعنی: "مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی، اپنی اصلاح کی اور اللہ سے تمسک رکھا اور اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کیا۔" سورہ حج میں بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللہِ" (29) یعنی: "پس نماز قائم کرو اور زکات دو اور اللہ سے تمسک رکھو!"

یاد رہے سورہ آل عمران کی آیہ شریفہ ۱۰۳ کو اللہ نے اس وقت نازل کیا جب مدینہ منورہ میں صدیوں سے برسرپیکار دو مسلم قبیلوں اوس و خزرج کے درمیان رحمت اللعالمین تاریخی صلح کرادی تو فتنہ پرور یہودی

شاس بن قیس نے دونوں مسلمان قبیلوں کو بھڑکا کر پھر انہیں آپس میں لڑوانے کی سازش کی۔ اس سازش کو ناکام بناتے ہوئے اور ان مسلم قبیلوں کو تنبیہ کرنے آیت نازل ہوئی کہ رسول اللہ کی موجودگی میں جھگڑے کا کیا جواز ہے؟ (30) پھر مسلمانوں کو تقویٰ کی دعوت اور دین اسلام سے متمسک اور گذشتہ نسلی اختلافات کے مقابلے میں برادری اخوت کا حوالہ دے کر ہر طرح کے اختلافات سے روکا گیا ہے۔

فرقہ بندی کے نقصانات:

فرقہ بندی اور گروہ بندی چاہے کسی بھی سطح کی ہو کبھی مفید نہیں ہو سکتی۔ گروہ بندی، فرقہ واریت اور انتشار، کمزوری اور نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ رسول ﷺ کی وفات پر امت آپس کے اختلاف کا شکار ہو گئی اور یہ اختلاف روز بروز بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک گروہ دوسرے کی طرف کفر و شرک کی نسبت دینے لگا اور دشمنان اسلام نے موقع کو غنیمت جان کر مسلمانوں کے درمیان فاصلہ ڈالنے اور فرقہ واریت پیدا کرنے کے لئے کمر باندھ لی۔ بالآخر دشمن کافی حد تک کامیاب بھی رہا۔ اتحاد اور اجتماعت کے فقدان کی وجہ سے بعض اوقات ایسی صورتحال پیدا ہوتی ہے کہ گروہ در گروہ، جماعت در جماعت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے یہ فرقہ بندی کا بدترین دور ہوتا ہے۔ ایسے ہی وقت میں بدامنی، لاقانونیت، لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت گری اور کئی دوسری برائیاں جنم لیتی ہیں اور یوں معاشرہ جہنم نظیر بن جاتا ہے۔

قرآن کے فرامین میں غور کرنے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ صراط مستقیم، حبل اللہ، دین اسلام اور راہِ حق سے الگ سوچ اور نظریہ اپنا لینا فرقہ بندی ہے۔ اللہ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (31) یعنی: "اور یہ (صراط مستقیم) میرا راستہ ہے۔ اسی پر چلو اور دوسرے راستوں کے پیچھے نہ پڑو، ورنہ تمہیں اللہ کے راستے سے علیحدہ کر دیں گے؛ اللہ نے تمہیں اسی امر کی وصیت کی ہے، شاید کہ تقویٰ اختیار کرو۔"

سورۃ انعام میں ارشاد ہوتا ہے (اے رسول) جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کیا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ان سے آپ کا کوئی تعلق نہیں (32)۔ یعنی آپ کا ان سے کوئی رابطہ نہیں اور ان کا بھی آپ کے دین سے کوئی رابطہ نہیں۔ آپ کا دین توحید اور وحدت کا دین ہے اور ان کا دین تفرقہ اور اختلاف کا ہے۔ واضح رہے یہ آیتیں کسی خاص زمانہ یا خاص افراد کے لئے نہیں بلکہ عمومی حکم ہے جو تفرقہ پھیلائے۔ اختلاف کا بیج بو کر متحد

انسانوں کے شیرازے کو منتشر کرنے والے کا حساب خدائے منتقم کے ہاتھ میں ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: "خبردار! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے تفرقہ پیدا کیا واضح نشانیوں کے آجانے کے بعد بھی اختلاف کیا کہ ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔"(33) یقینا اتحاد فتح و کامرانی کا ضامن اور اختلاف و تفرقہ کمزوری او شکست کا پیش خیمہ ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرماتا ہے: وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ یعنی: "اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں اختلاف نہ کرو، ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔(34)

اللہ تعالی نے ہمیں ان بہترین الفاظ کے ذریعے سے اختلاف بین المسلمین سے منع فرمایا۔ ولا تنازعوا میں لفظ "تنازعوا" باب تفاعل سے ہے جس کا مادہ نزع ہے جس کا معنی کھینچنا۔ اللہ تعالی یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ آپس میں اختلاف نظر نہ رکھو۔ ہر کوئی صاحب مغز ہے پس سوچتا بھی ہے اور ہر کسی کی منفرد سوچ اور فکر بھی ہے پس افکار کو جمع کیا جانا چاہئے تاکہ مطلب پختہ ہو۔ بلکہ فرمارہا ہے "ولا تنازعوا" یعنی ایک دوسرے کے خلاف کھینچا تانی نہ کرو۔ اگر کھینچا تانی کروگے تو" فتفشلوا" ضعیف اور کمزور پڑ جاؤ گے "وتذهب ریحکم" یعنی تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ یعنی کنایتاً اشارہ خداوندی تمہاری شان و شوکت چلی جائے گی پھر ہوا تمہارے پرچم کو نہیں لہرائے گی بلکہ مسلمانوں کے مشترکہ دشمن کے پرچم کو لہرائے گی اور دشمن ڈیڑھ ارب مسلمانوں پر بزور اپنی رائے مسلط کریں گے۔

لہٰذا ہم مشترکہ دشمن اور سپر طاقتوں کے مقابلے میں آپس میں جنگ نہ کریں اور نہ سپر طاقتوں کے اتحاد قائم کریں بلکہ ضروری ہے کہ تمام مسلمان جو لاالہ اللہ محمد رسول اللہ کا کلمہ پڑھتے ہیں باہم متحد ہو کر دشمنان اسلام کا مقابلہ کریں۔ یہی وحدت کلمہ (اتحاد بین المسلمین) ہے۔ آج ہم میں سے ہر ایک کو مسلمان بننے کی سعی کرنی چاہیے۔ آج ہمیں عالم اسلام و مسلمین جہاں کی درد کی دوا کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور وہ ہے اتحاد۔ اگر ہم آپس میں لڑتے رہے، ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے تو نتیجہ یہ ہوگا ہمارا وجود مختلف ممالک سے تدریجاً اس طرح محو ہو جائے گا جس طرح اسپین سے ہمارا وجود فنا کر دیا گیا۔ جس طرح آج فلسطین سے مسلمانوں کو نکالا جا رہا ہے اور آج یہ کوشش پوری دنیا میں جاری ہے کہ ہمارے وجود کو فنا کر دیا جائے۔

نہ سمجھوگے تومٹ جاؤگے اے غافل مسلمانو　تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں !

آج ہندو قوم کی وحدت کی ضامن، محض ''دھرتی ماتا'' ہے، حالانکہ فکری و عملی لحاظ سے ان کے ہاں ہزاروں تضادات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ''آریہ سماج'' بت پرستی کے مخالف ہیں اور بت خانوں کی تعمیر کو ناجائز سمجھتے ہیں اور ''سناتن دھرمی'' بت پرستی کو دین سمجھتے اور بت خانوں کی تعمیر کو باعث ثواب سمجھتے ہیں۔ ''کائستھ'' باقاعدہ گوشت کھاتے ہیں، حالانکہ دیگر ہندو، گوشت، بالخصوص گائے کا گوشت نہیں کھاتے۔ غرضیکہ اس قسم کے تضادات ''ہندو دھرم'' کے ماننے والے فرقوں میں بکثرت پائے جانے کے باوجود ایک دوسرے سے کبھی متصادم نہیں ہوتے۔ ''ہولی''، ''دیوالی''، ''دسہرے'' کے جلوس نکالنے والوں سے جلوس نہ نکالنے والے جھگڑا نہیں کرتے۔ ایک دوسرے کے اعمال پر اعتراض ہر گز نہیں کرتے اور نہ اس کے راستے میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور نہ کسی کا راستہ بند کرتے ہیں۔ (35) اے کاش! ہم مسلمان بھی ان اقوام سے سبق سیکھتے۔ غیر مسلم اصولاً منتشر ہونے کے باوجود عملاً متحد ہیں لیکن ہم متحد ہونے کے باوجود، فرقوں میں تقسیم در تقسیم ہوتے جارہے ہیں۔ مسلمانوں کا ضعف، ذلت و خواری کثرت کے باوجود بے وقعت ہونا، منابع ثروت ہوتے ہوئے دوسروں پر انحصار، مسلمانوں سے عالمی سطح پر نفرت، وغیرہ فرقہ واریت کے ناقابلِ تلافی نقصانات ہیں۔

اتحاد واتفاق کے فوائد

اتحاد واتفاق ایک نعمت اور اتحاد مسلمانوں کی شان و شوکت، عزت و وقار میں اضافہ کرتا ہے۔ آپس میں اتحاد کی وجہ سے ہمدردی، اخوت اور محبت پیدا ہوتی ہے۔ ہمت و حوصلہ بھی بڑھتا ہے اور قت و بالا دستی کا باعث ہے۔ مشکل حالات اور جنگوں میں وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو متحد ہوں۔ اللہ تعالی نے اتحاد ویکجہتی کو ایک ہی آیت (آل عمران/ ۱۰۳) میں دو مرتبہ نعمت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے کہ کل کے عرب جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھیانک جنگیں چھیڑ دیا کرتے تھے خون کی ندیاں بہا دیا کرتے تھے لیکن جب اسلام اور ایمان ان کے دلوں میں جاگزیں ہوا تو وہ اپنے گذشتہ جھگڑوں کو بھول کر ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔ اسی لئے خداوند عالم نے اس کی نسبت خود اپنی جانب دی ہے اور اسے بندوں کے لئے اپنی نعمت قرار دیا ہے۔ پس ضروری ہے کہ ہم خود کو اتحاد کی تسبیح میں پروئیں اور اتحاد پر مشتمل آیاتِ و احادیث رسول پر عمل کرکے اللہ ورسولؐ کے حضور سرخرو اور نجات سے بہرہ مند ہوں۔

حوالہ جات

1 ۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۰۳

2 ۔ لوئیس معلوف، المنجد (عربی اُردو)، دار الاشاعت، کراچی، مطبع یازدہم، ۱۹۹۴ء، ص:۱۰۷۱

☆ خلیل احمد فراہیدی، کتاب العین، جوہری الصحاح، ج ۳، مطبع دوئم، موسسہ دار الھجرۃ، بیروت، ۱۴۰۹ق، ص:۲۸۱

☆ زبیدی، تاج العروس، المکتبۃ الحیات، بیروت، ج ۲، ص:۵۲۶

3۔کتاب فرہنگ ابجدی، ترجمہ المنجد الابجدی، (عربی فارسی)، مترجم: استاد رضا مہیار، مطبع اول، ۱۳۷۰ق، ناشر انتشارات اسلامی، تہران، ص:۱۰

4 ۔ محمد معین، فرہنگ معین، ج ۴، مطبع ۱۳۶۰ش، ص:۴۹۸۹

5 ۔ شیخ مفید، النکت الاعتقادیۃ، دار المفید، بیروت، مطبع دوئم، ۱۴۱۴ق، ۲۹

☆ طریحی، مجمع البحرین، ج ۴، نشر و فرہنگ اسلامی، مطبع دوم، ۱۴۰۸ق، ص:۴۷۴

6 ۔ سعید بن علی، وحدت جوامع، مرکز نشر و اسراء، طبع اول، ۱۳۸۰ش، ص:۱۴

7 ۔ علامہ حلی، فاضل مقداد، باب حادی عشر، الجامع فی ترجمۃ النافع، مترجم: میرزا محمد علی حسین شہرستانی، دفتر نشر معارف اسلامی، طبع سوم، ۱۳۷۶ق، ص۱۱۶

8 ۔ المعجم الوسیط، ج۱، ۱۳۸۵ش، ص:۱۰۱۷

9 ۔ علوی مقدم، محمد، وحدت در قرآن، مجموعہ مقالات کتاب وحد، بہ نقل از مجلّہ الازہر، ش رمضان المبارک، ۱۳۷۷ھ، ص۴۹

10 ۔ کفایت اردو لغت، ص۳۷

11 ۔ سورہ بقرہ، آیت:۳۰

12۔ سورہ حشر آیت نمبر:۷

13 ۔ سورہ آلِ عمران: ۱۰۳۔

14 ۔ شیخ طوسی، ابی جعفر محمد ابن الحسن، التبیان فی تفسیر القرآن، ج ۲، دار احیاء التراث العربی، ص۵۴۵-۵۴۶

15 ۔ الطبری، شیخ ابی علی الفضل ابن الحسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ج۱-۲، انتشارات ناصر خسرو، تہران، طبع ۲، ص:۸۰۳-۸۰۴

16 ۔ سید محمد حسین طباطبائی، المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۳، موسسہ اسماعیلیان، قم، الطبعۃ الخامسہ، ص۳۶۹

☆ حافظ عماد الدین ابو الفداء ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، مترجم: مولانا محمد جوناگڑھی، ص:۴۴۶

17 ۔ پروفیسر علی محسن صدیقی، بردۃ المدیح، ص۶۲

18 ۔ پروفیسر علی محسن صدیقی، بردۃ المدیح، ص ۶۲
19 ۔ علی اکبر ہاشمی رفسنجانی و جمع از محققان، تفسیر راہنما، ج ۲، دفتر تبلیغات اسلامی، قم، طبع ۳، ۱۳۸۹ق، ص: ۵۵۸
20 ۔ سورہ انبیاء : ۹۲۔ و سورہ مؤمنون : ۵۲۔
21۔ سورہ الشوریٰ : ۱۳۔
22 ۔ الشیخ محمد بن الحسن الحر العاملی، وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص : ۹
23 ۔ استاد محمد واعظ زادہ خراسانی، پیام وحدت، مجمع جہانی تقریب مذاہب، طبع اول، ص ۲۷۴
24 ۔ Lewis 1999, P131(1984) PP.8,62 یہودیت Ur.wikipedia.org/wiki
25 ۔ سورہ فتح، آیت : ۲۹
26۔ محمد بن عیسیٰ ترمذی، الترمذی فی السنن، ج ۴، کتاب الفتن عن رسول اللہ، باب ماجاء فی لزوم الجماعہ، حدیث ۲۱۶۷، ص: ۴۶۶
27۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ج ۱، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، طبع چہارم، ص: ۲۷۶
28 ۔ سورہ نساء، آیت : ۱۴۶
29 ۔ سورہ حج، آیت ۷۸
30 ۔ حاشیہ القرآن الکریم، ناشر : مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف، : ص : ۱۶۳
31 ۔ سورہ انعام : ۱۵۳۔
32 ۔ سورہ انعام : ۱۵۹۔
33 ۔ آلِ عمران : ۱۰۵۔
34 ۔ سورہ الانفال : ۴۶۔
35 ۔ مولانا شبیہ الحسنین محمدی، فرقہ پرستی کا زہر، مشمولہ : روز نامہ امن (کراچی)، مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۸۷ء، ادارتی صفحہ

*****

حلم وبردباری

سید مزمل حسین نقوی*

muzammilhussainnaqvi5@gmail.com

کلیدی کلمات: نفسیاتی صحت، قوت برداشت، صفات کمالیہ، حلم ائمہ اطہارؑ، عزت نفس، حلم کے فوائد

خلاصہ

غصے پر قابو پانے اور قوت برداشت کا نام حلم ہے، یہ صفات کمال میں سے ہے جو صفت حلم سے متصف ہوتا ہے وہ خدائی صفات کا مظہر بن جاتا ہے۔ حلیم انسان اپنے آپ کو بہت سے منفی جذبات سے بچالیتا ہے اور اس کی نفسیاتی صحت بھی اچھی ہوتی ہے۔خدا نے قرآن میں اپنے آپ کو گیارہ مرتبہ حلیم کہا ہے۔ قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کو حلیم کہا ہے۔اسی طرح حضرت نبی اکرم ﷺ کو بھی صفت حلم سے متصف ہونے کی تاکید فرمائی ہے۔روایات کے مطابق علم کے بعد سب سے بڑی صفت حلم ہے۔
نبی اکرم ﷺ اور ائمہ اطہارؑ کی حیات طیبہ حلم ونرمی خوئی سے بھری پڑی تھی جس کے بہت سے واقعات ذکر ہوئے ہیں۔ علمائے دین کی زندگیوں میں بھی حلم وقوت برداشت کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔رسول خداﷺ کے مطابق حلم کے فوائد یہ ہیں : اچھے اعمال، صالح افراد کے ساتھ دوستی، شخصیت میں اضافہ، پستی اور ذلت سے دوری، اعلیٰ مقامات تک رسائی، عفوودر گزر، لوگوں کو مہلت دینا، جاہلوں کے مقابلے میں خاموشی اختیار کرنا یہ ایسے امور ہیں جو ایک صاحب عقل اپنے حلم سے حاصل کرتا ہے۔

*۔ڈائریکٹر نور الہدی فاصلاتی نظام تعلیم، بارہ کہو، اسلام آباد۔

مقدمہ

حلم و بردباری ان اعلیٰ صفات میں سے ہے جو افراد کے لیے انفرادی طور پر اور قوموں کے لیے اجتماعی طور پر کامیابی و ترقی اور عزت و عظمت کا ذریعہ بنتی ہیں۔ حلم وہ دولت ہے جس کی وجہ سے انسان کے وجود میں ایسی قوت برداشت پیدا ہوتی ہے جو کسی بھی حالت میں انسان پر غصے کو غالب نہیں آنے دیتی۔ ایک حلیم انسان کو کتنی بھی تکلیف پہنچائی جائے، وہ صبر و ضبط سے کام لیتا ہے۔ بے شک جو افراد صبر سے کام لیتے ہیں وہ زندگی کی ہر مشکل کو ہنس کر جھیل لیتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ معاف کرنے سے جذباتی اور نفسیاتی صحت کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت پر بھی مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ معاف کرنا اور برداشت کر لینا ایک صحت افزا توانائی ہے۔ قوت برداشت رکھنے والا جلدی بلندیوں تک پہنچ جاتا ہے۔ البتہ قوت برداشت کا یہ معنی نہیں ہے کہ انسان بے انصافی اور ظلم بھی برداشت کر لے اور اس کے خلاف آواز نہ اٹھائے بلکہ ظلم کے خلاف اپنی آواز ضرور بلند کرنی چاہیے لیکن مہذب طریقے سے۔

حلم و بردباری قرآن کی نظر میں

حلم کی اہمیت کے لیے یہی کافی ہے کہ خدا نے قرآن میں گیارہ مرتبہ خود کو حلیم کہا ہے: "كَانَ اللّٰهُ عَلِيمًا حَلِيمًا" (1) یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حلم اور بردباری صفت کمال ہے کیونکہ اس ذات کی صفت ہے اور دوسرے مرحلے پر انبیاء و اولیاء کی صفت ہے۔ لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ جو شخص صفت حلم سے متصف ہو وہ خدا کا مظہر ہے۔ گویا اس نے خود کو خدا کے اتنے قریب کر لیا ہے کہ خدائی صفات کا اس میں عکس نظر آتا ہے۔ خداوند کریم اپنے خلیل جناب ابراہیمؑ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے "اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ" (2) یعنی: "بے شک ابراہیم بڑے بردبار، نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔" نیز حضرت اسماعیلؑ کے متعلق خدا فرماتا ہے: "فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ" (3) یعنی: "پس ہم نے اسے ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی۔" خدا کا حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی تمام صفات کمالیہ میں سے حلم کا ذکر کرنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ آپ دونوں اس صفت میں کمال کی منزل پر فائز تھے اور خدا کو بھی یہ صفت بہت پسند ہے۔ رسول خداﷺ جیسے حلیم اور بردبار کو نرمی خوئی کی سفارش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ" (4) یعنی: "تو (سخت کلامی کا) اچھے طریقے سے

جواب دے تب وہ بھی تیرا گہرا دوست بن جائے گا جس کے اور تیرے درمیان دشمنی تھی۔" اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نرم خوئی دشمنی کو دوستی میں بدل دیتی ہے۔ اگر ایک معاشرے کے تمام افراد حلم و بردباری کا مظاہرہ کریں تو اس معاشرے سے کینہ و بغض ختم ہو جائے گا نفرت کی آگ بجھ جائے گی اور معاشرہ امن و سکون کا گہوارہ بن جائے گا۔

اس کا صحیح عکس ہمیں رسول خدا ﷺ کی ذات میں نظر آتا ہے۔ جس معاشرے میں آنحضرت ﷺ تشریف لائے تھے، وہ قتل و خونریزی کا مرکز تھا۔ رسول خدا ﷺ نے اپنے حسن اخلاق اور نرم خوئی سے انھیں بھائی بھائی بنا دیا: "فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ" (5) یعنی: "خدا کی رحمت سے تو ان کے لیے نرم دل واقع ہوا ہے اگر تو سخت مزاج اور سخت دل ہوتا تو یہ تیرے پاس سے بھاگ جاتے۔" ان آیات سے چار نکات سامنے آتے ہیں: **الف)** حلم خدا کی صفات میں سے ہے۔ **ب)** انبیاء علیہم السلام اور اولیاء الٰہی کی خصوصیات میں سے ہے۔ **ج)** خدا نے رسول خدا ﷺ کو نرم خوئی اور قوت برداشت سے کام لینے کا حکم دیا ہے۔ **د)** رسول خدا کی کامیابی اور دینی اہداف تک رسائی آپ کے نرم خو ہونے اور قوت برداشت سے کام لینے کی مرہون منت ہے۔

حلم از نظر روایات

علم کے بعد افضل ترین معنوی کمال حلم ہے بلکہ حلم کے بغیر علم سود مند ثابت نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے جب علم کی عظمت بیان کی جاتی ہے تو ساتھ حلم کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ رسول خدا ﷺ فرماتے ہیں: "اللهم اغننی بالعلم وزیّنی بالحلم" (6) یعنی: "اے پروردگار مجھے علم کے ذریعے سے بے نیاز کر دے اور حلم کے ساتھ زینت دے۔" ایک دفعہ رسول خدا ﷺ نے صحابہ سے کہا خدا کے نزدیک اعلیٰ اور بلند مقام کی تلاش کرو۔ صحابہ نے پوچھا کس طرح خدا کے نزدیک بلند مقام حاصل کیا جا سکتا ہے فرمایا: "جو تجھ سے تعلقات قطع کرے اس سے تو تعلقات قائم رکھ۔ جو تجھے محروم کرے اسے عطا کر اور جو تجھ سے جاہلانہ سلوک کرے اس سے بردباری کے ساتھ پیش آ۔" (7)

رسول خدا ﷺ فرماتے ہیں جب قیامت کا دن ہوگا لوگ جمع ہوں گے۔ ایک ندا آئے گی کہ اہل فضل کہاں ہیں۔ کچھ لوگ کھڑے ہوں گے۔ انھیں جنت کی طرف جانے کا حکم ملے گا۔ وہ تیزی سے جنت کی طرف بڑھیں گے۔ راستے میں کچھ ملائکہ ان سے پوچھیں گے کہاں جا رہے ہو۔ وہ کہیں گے جنت کی طرف۔ ملائکہ کہیں گے بغیر

حساب کے، کہیں گے ہاں۔ پوچھیں گے تم کون ہو، کہیں گے ہم اہل فضل ہیں۔ پوچھیں گے کس بنا پر تم اہل فضل ہو؟ جواب دیں گے: "جب ہم سے جاہلانہ سلوک ہوتا تھا تو برداشت سے کام لیتے تھے اور جب ظلم ہوتا تو صبر کر جاتے تھے اور جب کوئی ہماری ساتھ برائی کرتا تو معاف کر دیتے تھے۔"(8)

حلم کی عظمت کے لیے یہی کافی ہے کہ جب امیر المومنینؑ سے پوچھا گیا کہ خیر کیا ہے تو آپؑ نے فرمایا: "خیر یہ نہیں ہے کہ تیرا مال اور تیری اولاد زیادہ ہو بلکہ خیر یہ ہے کہ تیرا علم زیادہ ہو اور تیرا حلم وسیع ہو۔"(9) ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ مرد کا حسن اس کا حلیم اور بردبار ہونا ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی عزت نہیں ہے۔ انبیاء کرامؑ اور اہل بیت رسولؐ ہمارے لیے نمونہ کامل ہیں۔ ان کی پیروی کرکے ہم بھی منزل کمال پر فائز ہو سکتے ہیں۔ جب ہم ان برگزیدہ ہستیوں کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو حلم و بردباری ان کی نمایاں خصوصیات نظر آتی ہیں۔ یہاں پر رسول خداﷺ اور آئمہ معصومینؑ کے حلم کے چند واقعات ذکر کرتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا حلم

عبداللہ بن سلام یہودی تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے نبوت کا اعلان کیا تو یہ بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کے ایک دوست زید بن شعبہ تھے جو دین یہودیت پر تھے۔ عبداللہ زید کو بھی اسلام کی دعوت دیتے رہتے تھے لیکن وہ مسلمان نہیں ہوتے تھے۔ کئی بار اصرار کیا لیکن وہ اپنے دین پر قائم رہے۔ عبداللہ کہتے ہیں کہ ایک دن میں مسجد نبوی میں آیا تو دیکھا وہ نماز کی صف میں بیٹھے ہیں۔ مجھے بڑی حیرانگی ہوئی کہ یہ کیسے مسلمان ہو گئے۔ میں ان کے پاس گیا اور پوچھا تم کب مسلمان ہوئے اور کس وجہ سے ہوئے ہو۔ کہنے لگے ایک دن میں تورات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جب میں ان آیات پر پہنچا جو حضرت محمد ﷺ کے بارے میں تھیں تو ان پر غور کرنے لگا۔ ان میں آپ ﷺ کی صفات بیان کی گئی تھیں۔ میں نے سوچا محمد ﷺ کے پاس جاتا ہوں دیکھتا ہوں کیا ان میں یہ صفات موجود ہیں۔ ان صفات میں سے ایک حلم اور بردباری تھی۔ میں چند دن آپ ﷺ کے ساتھ رہا۔ آپ ﷺ کی تمام حرکات و سکنات پر نظر رکھی۔ تورات کی بتائی ہوئی تمام صفات ان میں پائی جاتی تھیں لیکن ابھی تک ان کے حلم کو جانچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں تورات میں پڑھ رکھا تھا کہ محمد ﷺ کا حلم ان کے غصے پر غالب آجاتا ہے۔ جہلاء جو بھی ان سے سلوک کریں قوت برداشت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

اس صفت کو دیکھنے کے لیے ہر روز مسجد میں آتا تھا۔ پھر ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک دیہاتی اونٹ پر سوار آپ کے پاس مسجد میں آیا۔ آنحضرت ﷺ کو دیکھ کر نیچے اترا اور کہا قحط کی وجہ سے ہمارا قبلہ فقر و فاقہ میں مبتلا ہو گیا ہے۔ قبیلے والے مسلمان ہیں اور آپ سے امید لگائے ہوئے ہیں۔ یقیناً آپ ہم پر احسان کرتے ہوئے ہماری مدد کریں گے۔ آپؐ نے حضرت علیؑ سے کہا گذشتہ مال غنیمت میں سے کچھ بچا ہے۔ عرض کیا نہیں۔ آپ ﷺ پریشان ہو گئے۔ اس وقت میں آگے بڑھا اور کہا اے پیغمبر اسلام میں آپؐ سے ایک سودا کرتا۔ آج مجھ سے پیسے لے لیں جب کھجوریں پک جائیں گی تو مجھے اتنی مقدار دے دینا۔ آپؐ نے معاملہ کر لیا۔ سودا طے ہو گیا مجھ سے پیسے لے کر اس دیہاتی کو دے دیے۔ میں انتظار میں رہا۔ ابھی کھجوریں اتارنے میں آٹھ دن باقی تھے۔

ایک دن میں بیابان میں گیا تو دیکھا رسول خدا ﷺ ایک درخت کے سائے میں بیٹھے ہیں اور آپؐ کے گرد آپ کے ساتھی بھی موجود ہیں۔ میں غصے سے آگے بڑھا اور آپؐ کا گریبان پکڑ کر کہا میں آپؐ کو اچھی طرح جانتا ہوں لوگوں کا مال لیتے ہو پھر واپس نہیں کرتے۔ آپؐ کو چند دن کی مہلت اور ہے میں گستاخی کر رہا تھا کہ عمرؓ تلوار لہراتے ہوئے آگے بڑھا اور مجھے مارنے لگا کہ آنحضرت ﷺ نے اسے روک دیا اور اس سے کہا اتنی کھجوریں مجھے دو۔ عمرؓ مجھے ساتھ لے گئے اور میرا حق مجھے دیا اور کچھ زیادہ بھی دیا۔ میں نے کہا یہ زیادہ کس لیے کہا حلم محمد ﷺ کی وجہ سے۔ انھوں نے مجھے کہا ہے کہ اتنی مقدار زیادہ دینی ہے۔ جب میں نے یہ دیکھا تو فوراً مسلمان ہو گیا۔(10)

امام طبرانی نے بھی اسی طرح کی ایک روایت لکھی ہے جو حدیث الصنب کے نام سے مشہور ہے۔ اس حدیث کے مطابق قبیلہ بنی سلیم کا ایک دیہاتی رسول خدا ﷺ کے پاس آیا اور اس نے آنحضرت ﷺ کے حضور گستاخی کی۔ اس پر حضرت عمرؓ جوش میں آگئے اور کہنے لگے: "ائے اللہ کے رسول ﷺ آپ اجازت دیں میں ابھی اس کا سر قلم کر دوں۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "اما علمت ان الحلیم کاد ان یکون نبیا" یعنی: "تجھے نہیں معلوم حلیم انسان نبوت کے مرتبہ کے کتنا قریب ہوتا ہے۔" تب اعرابی نے آپؐ سے مطالبہ کیا کہ وہ "سوسمار" جسے اس نے شکار کیا ہوا تھا، آپؐ کی نبوت کی گواہی دے دے تو وہ بھی آپؐ کی نبوت پر ایمان لے آئے گا۔ چنانچہ آپ کے حسن سلوک اور اس جانور کی گواہی دینے پر وہ مسلمان ہو گیا اور کہنے لگا: جب میں آیا تھا تو مجھے سب سے زیادہ نفرت آپ سے تھی اور اب جب جا رہا ہوں تو مجھے کائنات کی ہر شے سے زیادہ آپ سے محبت ہے۔(11)

ائمہ طاہرین علیہم السلام کا حلم

ایک دن حضرت علی علیہ السلام نے اپنے غلام کو کئی بار آواز دی لیکن وہ نہ آیا۔ کوئی جواب نہ دیا۔ آپؑ باہر آئے تو دیکھا دروازے کے پیچھے کھڑا ہے۔ فرمایا میں نے تجھے کتنی آوازیں دی ہیں اور تو نے جواب ہی نہیں دیا۔ کہنے لگا آپؑ کی حلم کی وجہ سے یہ جسارت کی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ آپؑ بہت حلیم ہیں۔ سزا نہیں دیں گے۔ اسی لیے مطمئن تھا۔ اسی بناپر آپؑ نے اسے آزاد کر دیا۔

ابن عائشہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک شامی نے امام حسن علیہ السلام کو دیکھا تو برا بھلا کہنے لگا۔ جب وہ گالیاں دے چکا تو آپؑ مسکراتے ہوئے اس کے پاس آئے اور کہا: "لگتا ہے تم اجنبی ہو۔ میرے بارے میں تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ اگر کوئی خواہش ہو تو پوری کرتا ہوں۔ اگر کچھ چاہیے تو عطا کرتا ہوں۔ اگر ہدایت کے طالب ہو تو راہنمائی کروں گا۔ اگر سواری چاہیے تو سواری دوں گا۔ اگر بھوکے ہو تو کھانا کھلاتا ہوں، اگر لباس کی ضرورت ہے تو لباس دیتا ہوں۔ اگر فقیر ہو تو مال دیتا ہوں، اگر مفرور ہو تو پناہ دیتا ہوں اور اگر رہنے کے لیے جگہ چاہیے تو میرا گھر حاضر ہے۔ جب تک چاہو میرے مہمان رہو۔ میں بہت اچھا میزبان ہوں۔ میرا گھر بہت بڑا ہے۔" جب اس نے سنا تو رونے لگا اور کہا: "میں گواہی دیتا ہوں کہ تو اس زمین پر خدا کا خلیفہ ہے اور خدا جسے چاہتا ہے اپنی رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے پہلے میں سب سے زیادہ آپؑ اور آپؑ کے والد سے نفرت کرتا تھا اور اب ساری کائنات میں سب سے زیادہ آپؑ اور آپؑ کے والد سے محبت کرتا ہوں۔" (12)

عبدالرزاق کہتے ہیں کہ ایک دفعہ امام سجاد علیہ السلام کی ایک کنیز آپؑ کے ہاتھ دھولا رہی تھی۔ آپؑ نے سر کو بلند کیا۔ اس کے ہاتھ سے برتن گر گیا اور آپؑ کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ آپؑ نے اس کی طرف دیکھا اس نے کہا خدا فرماتا ہے والکاظمین الغیظ متقی وہ ہے جو اپنے غصے کو پی جاتے ہیں۔ فرمایا میں نے اپنے غصے کو پی لیا۔ اس نے پھر آیت پڑھی والعافین عن الناس لوگوں سے در گزر کرتے ہیں۔ فرمایا خدا تجھے معاف کرے۔ اس نے پھر آیت پڑھی: واللہ یحب المحسنین خدا احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ آپؑ نے فرمایا جا میں نے تجھے راہ خدا میں آزاد کیا۔ (13)

حلم علامہ کاشف الغطاء

علامہ کاشف الغطاء مکتب تشیع کے بہت بڑے فقیہ گزرے ہیں۔ عید فطر کے دن امیر المومنین علیہ السلام کے حرم میں نماز عید پڑھا چکے تو ایک فقیر آیا اور کہا ضرورت مند ہوں زکوۃ فطرہ میں سے میری مدد کیجیے۔ فرمایا تمام زکوۃ فطرہ

مستحقین میں تقسیم کر چکا ہوں۔ ابھی تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ فقیر کو غصہ آگیا۔ آپ کے منہ پر تھوک کر کہتا ہے اتنے بڑے فقیہ ہو اور تمھارے پاس مجھے دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ نے اپنے منہ اور داڑھی سے تھوک صاف کیا۔ اٹھے اور اپنی عبا کو اتار کر صفوں کے درمیان چلنے لگے اور نمازیوں سے کہا اگر ممکن ہو تو کچھ پیسے اس میں ڈالتے جایئے۔ اس طرح کچھ پیسے اکٹھے ہو گئے اور آپ نے اس فقیر کو دے دیے۔ (14)

حلم کے اثرات

اسلام نے ہمیں ہمیشہ حلم کا دامن تھامنے اور جذباتی مواقع پر خود کو قابو میں رکھنے اور برداشت سے کام لینے کا حکم دیا ہے: "وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ O وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ" (15) یعنی: "اور نیکی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی لہٰذا تم برائی کا جواب اچھائی سے دو پھر تم دیکھو گے کہ جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہے وہ گہری دوستی میں بدل گئی ہے اور یہ صلاحیت انہی کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں اور یہ انہی کو حاصل ہوتی ہے جو بڑی قسمت والے ہوتے ہیں۔"

اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے ابن عباس کہتے ہیں: "خدا نے اس آیت میں ایمان والوں کو غیظ و غضب میں صبر، نادانی اور جہالت کے وقت حلم و بردباری اور برائی کے مقابلے میں عفو و درگزر کا حکم دیا ہے۔ جب وہ ایسا کریں گے تو خدا انھیں شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گا اور دشمن اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں گے جیسے گہرے دوست ہوں۔" (16) تو گویا حلم کا ایک اثر دشمنی کا خاتمہ اور اس کا دوستی میں بدل جانا ہے۔ اسی طرح غصے کے اثرات اور غیظ و غضب کے منفی اثرات سے بھی بردبار انسان محفوظ رہتا ہے۔ دوسروں کے سامنے اس کی عزت بڑھ جاتی ہے۔ چونکہ لوگ غصہ کرنے والے کی بجائے بردبار انسان کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "بردبار انسان کو اس کے حلم و بردباری کا پہلا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کے مخالف کے مقابلے میں اس کے مددگار بن جاتے ہیں۔" (17)

اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ خدا کسی شخص کی جہالت کی وجہ سے اسے عزت نہیں دیتا اور کسی شخص کو اس کی بردباری کی وجہ سے ذلت میں نہیں پڑنے دیتا۔ بردبار انسان لوگوں کے درمیان صاحب عزت سمجھا جاتا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "من حلم لم یفرط فی امرہ وعاش فی الناس حمیداً" (18) یعنی: "جو بردبار ہوتا ہے وہ اپنے امور میں غلطیاں کم کرتا ہے اور لوگوں کے درمیان اچھی زندگی بسر کرتا ہے۔" رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حلم اور

بردباری کے فوائد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اچھے اعمال، صالح افراد کے ساتھ دوستی، شخصیت میں اضافہ پستی اور ذلت سے دوری، نیکیوں کی طلب، اعلیٰ مقامات تک رسائی، عفو و درگزر، لوگوں کو مہلت دینا۔ جاہلوں کے مقابلے میں خاموشی اختیار کرنا یہ ایسے امور ہیں جو ایک صاحب عقل اپنے حلم سے حاصل کرتا ہے۔(19)

کیسے حلیم بنیں؟

درج ذیل امور کو حلم و بردباری کا سرچشمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

۱۔ **خود پر کنٹرول:** جو شخص اپنے نفس پر کنٹرول کی صلاحیت رکھتا ہے۔ قوت ارادی کا مالک ہے۔ غیر مناسب رویوں کے سامنے خود پر قابو پا سکتا ہے اس کے اندر جلد ہی صفت حلم پیدا ہو جاتی ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "یقیناً حلم غصے کو پینے اور نفس پر قابو پانے کا نام ہے۔" (20)

۲۔ **عزت نفس:** جو انسان خود کو شریف النفس سمجھتا ہے اپنی شخصیت اور عزت کا قائل ہے وہ بردبار بن جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی عزت اور وقار اسے اجازت نہیں دیتے کہ وہ بے قابو ہو جائے اور جاہلوں کے ساتھ جھگڑ کر اپنی عزت کو خاک میں ملا دے۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "بردباری اور صبر دو جڑواں چیزیں ہیں جو بلند ہمتی سے پیدا ہوتی ہیں۔" (21)

۳۔ **خدا پر ایمان:** خدا پر پختہ ایمان بھی حلم کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "حلم اور بردباری اللہ کا وہ چراغ ہے جس کے ذریعے بردبار انسان اپنے ارد گرد کو روشن کرتا ہے۔ انسان اس وقت تک بردبار نہیں ہو سکتا جب تک انوار الٰہی، انوار معرفت اور انوار توحید اس کی پشت پناہی نہ کریں۔" (22) پس جو شخص اپنے اندر حلم جیسی عظیم صفت پیدا کرنا چاہتا ہے وہ خدا پر اپنے ایمان کو پختہ کرے۔ اس کی معرفت کے حصوں کی کوشش کرے۔ توحید حقیقی پر ایمان رکھے۔ یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب وہ ہر کام کے انجام دیتے وقت اللہ کی رضا کو مد نظر رکھے گا۔

۴۔ **عقلمندی:** اگر کوئی شخص بردبار بننا چاہتا ہے تو اسے اپنی عقل میں اضافہ کرنا ہوگا۔ کیونکہ جس قدر عقل ہوگی اس قدر اس میں حلم و بردباری آئے گی۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "حلم وہ نور ہے جس کا مرکز عقل ہے۔" (23) نیز فرمایا: "عقل کے اضافے سے حلم میں اضافہ ہوتا ہے۔" (24)

لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی عقل میں اضافہ کرے۔ اسے بڑھانے کی کوشش کرے۔ شریعت نے ایسے بہت سے امور کی نشاندہی کی ہے جو عقل میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً غور و فکر، علمی جستجو، صاحبان علم و عقل اور حکماء کی صحبت اختیار کرنا، دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا اور جذبات اور نامناسب خواہشات پر کنٹرول کرنا ایسے امور ہیں جن سے عقل زیادہ ہو جاتی ہے۔

۵۔ تمرین: حلم کے اسباب میں سے ایک تمرین اور مشق بھی ہے۔ یعنی آہستہ آہستہ بردباری کی عادت ڈالنا، بردبار افراد کی پیروی کرنا۔ انہی جیسے اطوار اپنانے کی کوشش کرنا۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں "من تحلم حلم" "جو بردبار بننے کی کوشش کرتا ہے وہ بردبار بن جاتا ہے" ومن لا یتحلم لا یحلم" جو کوشش نہیں کرتا وہ نہیں بن سکتا۔ اسی طرح امام صادقؑ فرماتے ہیں: "اذا لم تکن حلیما فتحلم" (25) یعنی: "اگر حلیم و بردبار نہیں ہے تب بھی خود کو بردبار ظاہر کرو۔"

ظاہر سی بات ہے جب انسان ظاہری اعضاء سے بردباری ظاہر کرتا ہے تو آہستہ آہستہ یہ صفت اس کی روح اور نفس میں رچ بس جاتی ہے کیونکہ جسم اور روح کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ لہٰذا اگر ہم حلیم نہیں ہیں تو حلیم بننے کی کوشش ضرور کریں تاکہ یہ صفت کمالیہ ہم میں آجائے البتہ یہ بھی یاد رہے کہ ہر جگہ حلم و بردباری کا مظاہرہ کرنا مناسب بھی نہیں ہوتا۔ اگر کہیں بردباری جاہلوں کے لیے جسارت کا باعث بنے۔ یعنی اگر ان کے سامنے بردباری کا مظاہرہ کیا جائے تو وہ حد سے تجاوز کرنے لگ جائیں۔ ان میں جرأت پیدا ہونے لگے تو وہاں حلم پسندیدہ نہیں ہے۔ علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "اذا کان الحلم مفسدۃ کان العفو معجزۃ" (26) یعنی: "جب حلم فساد کا باعث بنے وہاں برداشت سے کام لینا ناتوانی کی دلیل ہے۔" مختصر یہ ہے کہ جہاں حلم و بردباری مفید ہو وہاں اس کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور جہاں خرابی پیدا کرے تو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

حوالہ جات

1۔ احزاب: ۵۱

2۔ ھود: ۷۵
3۔ صافات: ۱۰۱
4۔ حم سجدہ: ۳۴
5۔آل عمران: ۱۵۹
6۔ متقی ہندی (م ۹۷۵) کنزالعمال، بیروت، لبنان، موسسۃ الرسالۃ، طبع ۱۹۸۹، ج ۲، ص ۱۸۵، ح ۳۶۶۳
7۔ابن ابی دنیا (۲۸۱) مکارم الاخلاق، قارہ، مصر، مکتبۃ القرآن، ص ۲۳، ح ۲۳
8۔ابن کثیر (۴۷۷) البدیۃ والنھایۃ، بیروت، لبنان، داراحیاء التراث، ج۹، ص ۱۳۳
9۔ نہج البلاغہ، ج ۴، ص ۲۱، کلمات قصار، ۹۴
10۔ فیض کاشانی، محجۃ البیضاء
11۔ طبرانی، (م ۳۶۰) المعجم الصغیر، بیروت، لبنان، دارالکتب العلمیۃ، ج ۲، ص ۶۴
12۔ابن شہرآشوب (۵۸۸) مناقب آل ابی طالب نجف اشرف، عراق، مطبعۃ الحیدریۃ، طبع ۱۹۵۹ء، ج ۳، ص ۱۸۴
13۔ شیخ صدوق (۳۸۱) الامالی، قم، ایران، موسسہ البعثۃ، طبع اول، ۱۴۱۷ھ، ص ۲۶۹
14۔ حسین انصاریان، عرفان اسلامی، قم ایران، دارالفرقان، طبع ۱۳۸۶ش، ج ۱۰، ص ۲۸۳
15۔فصلت۔ ۳۴و۳۵
16۔ابن کثیر (م ۴۷۷)، تفسیر القرآن العظیم، بیروت، لبنان، دارالکتب العلمیۃ، ج ۷، ص ۱۶۵
17۔ علی بن محمد واسطی (۶ق) عیون الحکم والمواعظ، دارالحدیث، طبع اول، ص ۵۵،
18۔ کلینی (۳۲۹) الکافی، تہران، ایران، دارالکتب الاسلامیہ، طبع چہارم، ج ۲، ص ۵۱
19۔ابن شعبہ حرانی (۴ق) تحف العقول، قم، ایران، موسسۃ النشر الاسلامی، ص ۱۶
20۔ابن شعبہ حرانی (۴ق) تحف العقول، قم، ایران، موسسۃ النشر الاسلامی، ص ۱۷۷
21۔ نہج البلاغہ کلمات نمبر ۴۶۰
22۔ مصباح الشریعۃ المنسوب للامام الصادق، بیروت، لبنان، طبع اول ۱۹۸۰، موسسہ الاعلمی، ص ۱۵۴
23۔ علی بن محمد واسطی (۶ق) عیون الحکم والمواعظ، دارالحدیث، طبع اول، ص
24۔ علی بن محمد واسطی (۶ق) عیون الحکم والمواعظ، دارالحدیث، طبع اول، ۸۸
25۔ کلینی (۳۲۹) الکافی، تہران، ایران، دارالکتب الاسلامیہ، طبع چہارم، ج ۲، ص ۱۱۲
26۔ری شہری، میزان الحکمۃ، دارالحدیث، ج ۱، ص ۶۸۹، ح ۴۸

*****

قرآن وحدیث کی روشنی میں
اضطراب سے مقابلے کے طریقے (۲)

سید عقیل حیدر زیدی*

aqeel.zaidi1968@gmail.com

کلیدی الفاظ: اضطراب، بے چینی، آرام وآسا+ئش، ایمان، توکل، آرزو، رزاقیت پروردگار، زہد، صبر، اجتماعی تعلقات۔

خلاصہ

دین مبین اسلام نے جامع اور کامل نظام بشری ہونے کے عنوان سے،انسان کو درپیش ہر قسم کے اسٹریس (Stress)اور اضطراب کا مقابلہ کرنے کے لئے بنیادی طریقے بیان کئے ہیں۔اضطراب اور نفسیاتی دباؤ سے چھٹکارا پانے کے لئے لمبی لمبی امیدیں ترک کرنا ناگزیز ہے۔ اسی طرح ناخوشگوار واقعات اور مشکلات پر صحیح اور دانشمندانہ ردّعمل،آرام وسکون کا باعث اور اضطراب سے نجات کا موجب بنتا ہے۔ نفسیاتی دباؤکاایک اہم عامل ہمارا حقائق سے پہلو تہی کرنا ہے۔

اگر ہم اپنی زندگی کو دنیا کی حقیقتوں کے ساتھ ہم آہنگ کرلیں تو ہر قسم کے اضطراب وپریشانی کا سدباب ہوسکتا ہے دنیا کی حقیقت یہ ہے کہ اس کی خوشیاں، غم اندوہ کے ہمراہ ہیں۔اس بات کی طرف متوجہ رہے وہ بہت ساری پریشانیوں سے بچ سکتا ہے۔ نفسیاتی دباؤ سے بچاؤکاایک اور ذریعہ انسان کے اچھے سماجی تعلقات ہیں۔ انسان صلہ رحمی کرے، حسد نہ کرئے، غصے اور غضبناک ہونے سے پرہیز کرئے تو وہ اضطراب سے پاک آرام وسکون کی زندگی گزار سکتا ہے۔

*۔پی۔ایچ۔ڈی اسٹوڈنٹ دانشگاہ علوم اسلامی رضوی، مشہد مقدس، اسلام جمہوریہ ایران۔

۶۔ لمبی اور دراز آرزوؤں کا کم کرنا

اُمید اور نااُمیدی کا اثر زندگی میں ناقابل انکار ہے اور واضح طور قابلِ ملاحظہ ہے۔ جس طرح کہ اُمیدوار اور نااُمید انسان بھی آپس میں مختلف ہیں۔ نااُمید افراد ہمیشہ اس چیز پر تکیہ کرتے ہیں کہ: کب تک کام کرنا چاہیے؟ کیوں زندگی گزارنا چاہیے؟ آخر زندگی گزارنے کا فائدہ کیا ہے؟ اس گروہ کے لیے زندگی، بے مزہ، تاریک، بے روح، تلخ اور تکلیف دہ ہوگی۔ لیکن وہ لوگ جو اُمیدوار ہوتے ہیں، کہتے ہیں: جب تک انسان کی عمر ہے، زندگی گزارنا چاہیے۔ زندگی کے بارے میں یہ دو مختلف نقطۂ نظر ہیں۔

لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اور اگر اس حد کی رعایت نہ کی جائے، تو افراط و تفریط میں سے کوئی ایک پہلو اختیار کر لیتی ہے۔ اُمید بھی اسی طرح سے ہے۔ ''نااُمیدی'' اس کا تفریطی پہلو ہے؛ جبکہ اس کا افراطی پہلو بھی ہے کہ جسے دینی فرہنگ و ثقافت میں لمبی اور دراز آرزوؤں'' کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے۔ طولانی اور دور دراز آرزو، یعنی وہ آرزوئیں جو ایک انسان کی عمر سے بھی تجاوز کر جاتی ہیں اور دنیا انہیں پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔

ہم نے بیان کیا کہ اُمید اس لیے ہے کہ جب تک زندہ ہیں زندگی گزاریں؛ یعنی اُمید کے دائرہ کار کو عمر معین کرتی ہے؛ لیکن بعض لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آرزوؤں کے جتنا ہی زندہ رہنا اور زندگی گزارنا چاہیے اور انسان کی آرزوئیں کسی وقت ختم نہیں ہوتیں، جبکہ اس کی عمر محدود ہے۔

اس غلط عقیدے کی بنیاد کو ''شناخت و معرفت کی کمزوری'' میں تلاش کرنا چاہیے۔ یہ ایک اصل (اور واقعیت) ہے کہ محال چیز کی آرزو کرنا، نادانی اور جہالت کی علامت ہے۔ (1)

امام علی علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں:

''رَغْبَتُكَ فِي الْمُسْتَحِيلِ جَهْلٌ'' (2)

یعنی: ''محال چیز میں تیرا رغبت کرنا جہالت ہے۔''

بنابرایں، عقیدے کی اصلاح اور واقعیت و حقیقت کی صحیح شناخت، اس آفت و مصیبت کا راہِ حل ہے۔ آرزوؤں کو زندگی کی حقیقتوں سے ہماہنگ اور سازگار بنانا ضروری ہے۔ زندگی کی واقعیت، یہ ہے کہ ہر شخص کے لیے دنیا، چند روز سے زیادہ نہیں ہے اور انسان محدود عمر کا مالک ہے۔ جو شخص اس

حقیقت پر یقین پیدا کر لے اس کی آرزوئیں مختصر اور واقع کے مطابق ہو جائیں گی اور اس طرح کے حقائق کے ساتھ جو زندگی ہوتی ہے وہ انسان کو آرام و سکون پہنچاتی اور اضطراب کو دور کرتی ہے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ أَيْقَنَ أَنَّهُ يُفَارِقُ الْأَحْبَابَ وَيَسْكُنُ التُّرَابَ وَيُوَاجِهُ الْحِسَابَ وَيَسْتَغْنِي عَمَّا خَلَفَ وَيَفْتَقِرُ إِلَى مَا قَدَّمَ، كَانَ حَرِيّاً بِقَصْرِ الْأَمَلِ وَطُولِ الْعَمَلِ" (3)

یعنی: "جو شخص یہ یقین رکھتا ہو کہ دوستوں سے جدا ہو جائے گا اور مٹی تلے رہے گا اور حساب و کتاب سے رُوبرو ہوگا اور اس نے جو اپنے پیچھے چھوڑا ہے اس سے بے نیاز ہو جائے گا اور جو کچھ آگے بھیجا ہے اس کا محتاج ہوگا، سزاوار ہے کہ (ایسا شخص) اپنی آرزوؤں کو مختصر اور اپنے عمل کو طولانی کرے۔"

حضرت امام علی علیہ السلام ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

"لَوعُرِفَ الْأَجَلُ قَصُرَ الْأَمَلُ" (4)

یعنی: "اگر موت کو پہچان لیا جائے تو آرزوئیں مختصر ہو جاتی ہیں۔"

اور اسی بنیاد پر امام سجّاد علیہ السلام بیٹے امام محمد باقر علیہ السلام کو وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَإِيَّاكَ وَالْأَمَلَ الطَّوِيلَ فَكَمْ مِنْ مُؤَمِّلٍ أَمَلًا لَا يَبْلُغُهُ وَجَامِعِ مَالٍ لَا يَأْكُلُهُ" (5)

یعنی: "لمبی آرزوؤں سے اجتناب کرو؛ کیونکہ کتنے زیادہ آرزوئیں کرنے والے ایسے ہیں جو اپنی آرزوؤں کو نہیں پہنچتے اور کتنے مال جمع کرنے والے ایسے ہیں جو اپنا مال کھانے سے محروم رہتے ہیں۔"

اس طرح کی صورتحال اور حقائق کو ملاحظہ کرتے ہوئے، تعجب کا مقام ہے کہ کوئی شخص لمبی آرزوؤں میں مبتلا ہو جائے۔ طولانی آرزوؤں کی آفت سے بچنے اور زندگی کے راحت و سکون تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان دنیا اور اپنی عمر کے بارے میں دوبارہ سوچے اور غور و فکر کرے اور اپنے نظریے کو زندگی کی حقیقتوں کے ساتھ ہماہنگ بنائے۔ لمبی آرزو کی کچھ خصوصیات ہیں، جو باعث بنتی ہیں کہ انسان ذہنی دباؤ اور اضطراب سے دوچار ہو اور ہمیشہ زندگی کے نفسیاتی دباؤ سے لڑتا رہے۔ جبکہ لمبی آرزوؤں کا کم کرنا، انسان کو خاص آرام و سکون پہنچاتا ہے۔

آرزوئیں، کیونکہ ختم نہ ہونے والی اور حاصل نہ ہونے والی ہوتی ہیں، اس لیے خواہشوں کا پورا نہ ہونا اور آرزوؤں کا متحقق نہ ہونا بھی احساس ناکامی، اضطراب اور نفسیاتی دباؤ کا موجب بنتا ہے۔

حضرت امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"حاصِلُ الْمُنی الْاَسَفُ وَثَمَرَتُهُ التَّلَفُ" (6)

یعنی: "آرزو کا نتیجہ، کف افسوس ملنا اور اس کا پھل ضائع ہونا ہے۔"

طولانی اور دراز آرزوئیں ایک طرف تو قرار یہ ہے کہ انسان کو زیادہ سے زیادہ کامیابی تک پہنچائیں اور توقّع یہ ہے کہ اس راہ کے اختتام پر کامیابی، آرام و سکون اور زیادہ فائدہ ہو؛ جبکہ اس طرح کی آرزوئیں، نہ فقط یہ کہ انسان کو زیادہ کامیابیوں تک نہیں پہنچاتیں، بلکہ اسے مناسب و معقول اندازے سے بھی محروم کر دیتی ہیں۔

اسی جہت سے امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِتَّقُوا خِدَاعَ الْآمالِ، فَكَم مِن مُؤَمِّلِ يَوْمٍ لَمْ يُدْرِكْهُ وَبانِي بِناءٍ لَمْ يَسْكُنْهُ وَجامِعِ مالٍ لَمْ يَأْكُلْهُ وَلَعَلَّهُ مِن باطِلٍ جَمَعَهُ وَمِن حَقٍّ مَنَعَهُ أَصابَهُ حَراماً وَاحْتَمَلَ بِهِ آثِماً" (7)

یعنی: "آرزوؤں کے فریب سے بچو؛ کیونکہ کتنے ہی ایسے ہیں جو ایک دن کی آرزو رکھتے تھے لیکن اس دن کو نہ پا سکے اور عمارت کے بنانے والے ایسے ہیں جو اس میں نہ رہ سکے اور مال کے جمع کرنے والے ایسے ہیں جو اس سے نہ کھا سکے اور شاید انہوں نے اس مال کو باطل (حرام) سے جمع کیا تھا اور حقدار کو اس کے حق سے محروم کیا تھا، (پس) حرام میں گرفتار ہو گئے اور گناہ کا بوجھ (اپنے کاندھوں پر) اُٹھایا۔"

جو شخص لمبی لمبی امیدوں والا ہوتا ہے، وہ ہمیشہ لذّت کو اس چیز میں سمجھتا ہے جو خود نہیں رکھتا اور اسی وجہ سے، جو کچھ رکھتا ہے اس سے بہرہ مند نہیں ہوتا، اس طرح کے افراد ہمیشہ جو کچھ رکھتے ہیں اس سے نالاں اور ناراضی ہی رہتے ہیں اور ایسی چیزوں کی آرزو کرتے ہیں جو نہیں رکھتے۔ اہم بات یہ نہیں ہے کہ کیا کچھ رکھتے ہیں، اہم یہ ہے کہ ہمیشہ جو کچھ نہیں رکھتے، اُسے خوش بختی کا باعث سمجھتے ہیں اور جب ایک وقت اُسے پا لیتے ہیں کہ جس کی آرزو رکھتے تھے، تو پھر بھی فائدہ اور خوش بختی کا احساس نہیں کرتے اور اس چیز کے بارے میں جو دسترس سے دور ہے، سوچتے ہیں۔

اسی وجہ سے امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"تَجَنَّبوا الْمُنیٰ فَإِنَّها تَذْهَبُ بِبَهْجَةِ نِعَمِ اللهِ عِنْدَكُم وَتُلْزِمُ اسْتِصْغارَها لَدَيْكُم وَعَلَى قِلَّةِ الشُّكْرِ مِنْكُم" (8)

یعنی: "(طولانی) آرزوؤں سے اجتناب کرو، کیونکہ یہ تمہارے پاس خداوند عالم کی نعمتوں کی نشاط و طراوت کو ختم کر دیتی ہیں اور انہیں تمہارے نزدیک حقیر و معمولی بنا دیتی ہیں اور تمہیں کم شکر گزاری پر آمادہ کرتی ہیں۔"

ناشکری یا کم شکر گزاری، ان لوگوں کی خصوصیت ہے جو طولانی و لمبی امیدیں رکھتے ہیں؛ کیونکہ ان کی نظر میں کوئی ایسی چیز نہیں جو شکر گزاری کے قابل ہو اور جو کچھ وہ رکھتے ہیں، بے اہمیت سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ کمی اور محرومیت کا احساس کرتے ہیں اور کوئی شخص اس احساس کے ساتھ شکر گزاری نہیں کرتا۔

۷۔ صبر

سختیاں، زندگی کی ناقابلِ انکار حقائق میں سے ہیں اور انسان پر بہت زیادہ نفسیاتی دباؤ ڈالتی ہیں۔ ہر ناخوشگوار واقعہ اور حالت ہماری طرف سے ردِّ عمل بھی رکھتی ہے اور بنیادی طور مشکلات کے ظاہر ہونے کا فلسفہ بھی انسان کی ان مواقع کے مقابل میں ردّ عمل کی نوعیت کا پرکھنا ہے۔

بلاشک و تردید تمام انسان ناخوشگوار اور ناپسندیدہ مواقع پر ردّ عمل کا اظہار کرتے ہیں؛ لیکن اہم یہ ہے کہ یہ ردّ عمل صحیح اور دانشمندانہ ہو، صحیح ردِّ عمل آرام و سکون اور کامیابی کے ساتھ ملا ہوتا ہے جبکہ غلط ردّ عمل اسٹریس اور نفسیاتی دباؤ سے بھری زندگی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

الف) بے تابی اور بے صبری کا مظاہرہ کرنا

ناخوشگوار واقعات کے مقابلہ میں سب سے پہلا اور شاید رائج ترین ردّ عمل، بیتابی و بیقراری کا مظاہرہ کرنا ہے، قرآن کریم اس بارے میں فرماتا ہے:

"إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا * إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا" (9)

ترجمہ: "بیشک انسان بڑا حریص اور بے صبر اخلق کیا گیا ہے؛ جب بھی اسے کوئی بُرائی چھوتی ہے تو بے صبری و بیقراری سے فریاد کرتا ہے۔"

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"إِنَّ الجَزَعَ عَلَى المُصِيبَةِ أَن يَعمَلَ شَيئاً لَم يَكُن يَعمَلُهُ أَو يَترُكَ شَيئاً كَانَ يَعمَلُهُ" (10)

یعنی: "بے شک مصیبت پر بیتابی و بیقراری کرنا یہ ہے کہ جو کام نہیں کرتا تھا وہ انجام دے اور جو کام کرتا تھا اُسے ترک کردے۔"

معمولاً جب بھی کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہوتا ہے تو انسان زبانِ شکایت کھولتا ہے۔ کبھی یہ شکایت کرنا، بُرا بھلا کہنے کے ساتھ ہوتا ہے، کسی کی حرمت و عزّت کا خیال نہیں رکھا جاتا اور جو کچھ منہ میں آتا ہے، کہہ دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ شخص جو صابر و بردبار ہوتا ہے وہ شکوہ و شکایت کرنے اور بُرا بھلا کہنے والا نہیں ہوتا ہے۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"إِذَا ضَاقَ الْمُسْلِمُ فَلَا يَشْكُوَنَّ رَبَّهُ عَزَّ وَجَلَّ وَلْيَشْتَكِ إِلَى رَبِّهِ الَّذِي بِيَدِهِ مَقَالِيدُ الْأُمُورِ وَتَدْبِيرُهَا" (11)

یعنی: "جب بھی کوئی مسلمان کسی تنگی و دشواری سے دُچار ہو تو ہرگز (کسی اور سے) اپنے پروردگار کا شکوہ و شکایت نہ کرے؛ بلکہ ضروری ہے کہ اپنے پروردگار سے، کہ جس کے دستِ قدرت میں تمام اُمور کی باگ ڈور اور تدبیریں ہیں، شکایت کرے۔"

قابل توجہ یہ کہ اس طرح کے شکوہ و شکایتیں کرنا، انسان کی مشکل کو حل کرنے اور اس کی حالت کی بہبودی میں کوئی اثر نہیں رکھتے ہیں۔

امام علی علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں:

"اَلحُزنُ وَالجَزَعُ لَا يَرُدَّانِ الفَائِتَ" (12)

یعنی: "غمگیں ہونا اور بیقراری کرنا، ہاتھ سے چلی جانے والی چیز کو واپس نہیں پلٹاتے۔"

اس کے برعکس اس قسم کا ردّ عمل اُلٹا اثر بھی چھوڑ سکتا ہے، یہاں تک کہ انسان کی سختیوں اور نفسیاتی دباؤ کو بھی دوچند کرسکتا ہے۔

امام علی علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں:

"اَلجَزَعُ عِندَ المُصِيبَةِ يَزِيدُهَا وَالصَّبرُ عَلَيهَا يُبِيدُهَا" (13)

یعنی: ''مصیبت کے وقت بیقراری کرنا، مصیبت کو بڑھا دیتا ہے اور مصیبت پر صبر و بردباری سے کام لینا اُسے ختم کر دیتا ہے۔''

اسی وجہ سے، عقل یہ حکم دیتی ہے کہ انسان معمولی ناخوشگواریوں کو تحمل کرے اور بیقراری و بیتابی کا مظاہرہ کرکے اپنی مشکلات میں اضافہ نہ کرے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''لَاتَجزَعُوا مِن قَلِيلِ مَا أَكرَهَكُم فَيُوقِعَكُم ذَلِكَ فِي كَثِيرٍ مِمّا تَكرَهُونَ'' (14)

یعنی: ''چھوٹی چھوٹی اور معمولی ناخوشگواریوں پر بیقرار نہ ہو جاؤ کہ یہ تمہیں بڑی ناخوشگواریوں میں مبتلا کر دیں گی۔''

ب) بردباری اور صبر کا مظاہرہ

بیتابی و بیقراری کرنا، نہ فقط یہ کہ کوئی اثر نہیں رکھتا، بلکہ مصیبتوں کی مقدار بھی بڑھا دیتا ہے، پس سختیوں سے بہترین مقابلہ، صبر و تحمل اور بردباری کا اختیار کرنا ہے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''اَلجَزَعُ عِندَ الْمُصِيبَةِ يَزِيدُها وَالصَّبرُ عَلَيهَا يُبِيدُهَا'' (15)

یعنی: ''مصیبت کے وقت واویلا کرنا اُسے زیادہ کر دیتا ہے اور مصیبت پر صبر و تحمل کرنا اُسے جڑ سے اُکھاڑ دیتا ہے۔''

پس سختیوں سے حاصل ہونے والے نفسیاتی دباؤ کو کم کرنے کا واحد راستہ فقط صبر و تحمل کرنا ہے۔ صبر کرنا، بلا و مصیبت کے پائیدار رہنے کا موجب نہیں بنتا۔ سختیاں نہ تو جزع و فزع کرنے سے ختم ہوتی ہیں اور نہ ہی صبر کرنے کے ساتھ باقی رہتی ہیں۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ صبر کرنا، یعنی اس بلاو مصیبت کا ثابت و برقرار رکھنا ہے کہ اگر صبر نہ کریں تو حتماً ختم ہو جائے گی؟! یہ ایک باطل خیال ہے۔ مصیبتوں کا آنا جانا، جزع فزع اور صبر سے مربوط نہیں ہے، بلکہ یہ فقط ان کے عوارض اور نقصانات کو کم یا زیادہ کر سکتے ہیں۔

صبر و بردباری کرنا، مصیبت سے پیدا ہونے والے غم واندوہ کو کم کردیتا ہے؛ اسی وجہ سے، امام علی علیہ السلام مصیبتوں کے غم واندوہ کو کم کرنے کے لیے، صبر و تحمل کرنے کی سفارش کرتے ہیں:

"أُطْرُدُوا وَارِدَاتِ الهُمُومِ بِعَزَائِمِ الصَّبْرِ وَحُسْنِ الْيَقِيْنِ" (16)

یعنی: "آنے والے غم واندوہ کو صبر کرنے کے عزم وارادہ اور حُسن یقین کے ساتھ دور کردو۔"

اگر صبر بردباری موجود ہو تو کوئی حادثہ بھی مصیبت نہیں ہوگا:

"لَیسَ مَعَ الصَّبْرِ مُصِیْبَۃٌ" (17)

"صبر کرنے کے ساتھ کوئی مصیبت (مصیبت) نہ رہے گی۔"

اور یہ اس قدر اثر رکھتا ہے کہ گویا کوئی مصیبت وارد ہی نہیں ہوئی ہے:

"مَن صَبرَعَلَی النَّکبَۃِ کَاَنْ لَم یُنْکَبْ" (18)

"جو شخص مصیبت پر صبر کرے، گویا اس پر مصیبت آئی ہی نہیں ہے۔"

بنابرایں، زندگی کی سختیوں اور دشواریوں کے مقابلہ میں بہترین ردّ عمل، صبر کرنا اور بردباری کا مظاہرہ کرنا ہے۔ صبر اور اس کے آثار کے بارے میں ہم نے پچھلی فصل میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

۸۔ دنیا کے حقائق سے ہماہنگی

اگر زندگی کے بارے میں انسان کی نگاہ حقیقت پسندانہ ہو، تو زندگی سے اس کی توقّعات بھی حقیقت پسندانہ ہی ہوں گی اور اس کے نتیجہ میں زندگی سے اس کا احساس بھی واقع پسندانہ ہو جائے گا۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ "واقعیات و حقائق کی توقّعات سے ہماہنگی" خوشحال زندگی گزارنے اور اسٹریس سے دور رہنے کی بنیادی شرط ہے۔

"ناکامی" توقّعات اور حقائق کے درمیان عدم ہماہنگی کا نتیجہ ہے کہ جو افسردگی اور نارضایتی و ناراحتی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ واقع پسندانہ توقّعات رکھیں، البتہ حقیقت پر مبنی توقعات، زندگی اور جس دنیا میں ہم زندگی گزارتے ہیں، اس کی صحیح شناخت پر متوقّف ہے۔ (19)

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بنیادی اصول کے بارے میں فرماتے ہیں:

"لَو تَعلَمُونَ مِنَ الدُّنیا مَا اَعلَمُ لَاستَرَاحَتْ اَنْفُسُکُمْ مِنْها" (20)

یعنی: "اگر تم دنیا سے وہ سب کچھ جان لیتے جو میں جانتا ہوں تو تمہارا نفس اس سے آسودہ خاطر ہو جاتا۔"

امام علی علیہ السلام "دنیا کی شناخت" کے مرکزی اور بنیادی اثر کے بارے میں فرماتے ہیں:

"مَن عَرَفَ الدُّنیا، لَم یَحزَن لِلبَلوی" (21)

یعنی: "جو شخص دنیا کو پہچان لے وہ (دنیا کی) مصیبتوں سے غمگیں و محزون نہیں ہوتا۔"

اسی طرح آپؑ ایک دوسرے کلام میں فرماتے ہیں:

"مَن عَرَفَ الدُّنیا لَم یَحزَن عَلَی مَا اَصابَهُ" (22)

یعنی: "جو شخص دنیا کو پہچان لیتا ہے، وہ اپنے اُوپر آنے والی مصیبتوں پر غمگیں نہیں ہوتا۔"

دنیا کی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ دنیا، دنیا ہے اور بہشت نہیں ہے، یہ دنیا ہے اور دنیا سے بہشتی نعمتوں (23) کی توقّع رکھنا، ایک نامعقول چیز شمار ہوتا ہے۔ ہم دنیا میں اس لیے نہیں آئے کہ جس طرح چاہیں زندگی گزاریں اور جس طرح پسند کریں، اُسے منظّم کریں؛ بلکہ ہم، دنیا میں اس لیے آئے ہیں تاکہ اپنی مہارت اور ہنر کو اس کے معاملات کے ساتھ ہم آہنگ ہونے میں ظاہر کریں۔ (24)

نیز اس حقیقت کی طرف بھی ہماری توجہ رہے کہ ہم آخرت کے لیے خلق کئے گئے ہیں نہ کہ دنیا کے لیے۔ اگر ہمارا ہدف و مقصد آخرت ہو تو دنیا کی مشکلات برداشت کریں گے اور نفسیاتی دباؤ اور افسردگی سے دُچار نہیں ہوں گے۔

امام علی علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں:

"فَفِی الدُّنیا حُیِّیتُم وَلِلآخِرَةِ خُلِقتُم" (25)

یعنی: "تم دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے آئے ہو اور آخرت کے لیے خلق کئے گئے ہیں۔"

دنیا ہی زندگی و ہستی کی ہر چیز نہیں ہے اور یہاں انسان کی پوری زندگی اور دوام بھی نہیں ہے۔

امام علی علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں: "إنَّ الدُّنیا مَنزِلُ قُلعَةٍ وَلَیسَت بِدارِ نُجعَةٍ خَیرُها زَهِیدٌ وَشَرُّها عَتِیدٌ وَمُلکُها یُسلَبُ وَعامِرُها یُخرَبُ" (26)

یعنی: "بے شک دنیا ایسی منزل ہے کہ ہر لحظہ اس سے کوچ کے لیے تیار رہو اور (دنیا ہمیشہ) رہنے کی جگہ نہیں ہے، اس کی اچھائی تھوڑی اور اس کی بُرائی (ہر گھڑی) تیار و آمادہ ہے اور اس کی حکومت چھن جانے والی اور اس کی عمارتیں ویران ہونے والی ہیں۔"

دوسری حقیقت کہ جس کے ساتھ ضروری ہے خود کو ہم آہنگ کریں، وہ دنیا کے معمولی و حقیر ہونے کی طرف توجہ ہے۔ زیادہ تر نفسیاتی دباؤ دُنیوی مادّیات کو اہمیت دینے اور اِن کے ہاتھ سے دے دینے کی وجہ سے ہے۔ اگر انسان اس حقیقت کی طرف توجہ کرے کہ جو کچھ اُس نے ہاتھ سے دیا ہے یا وہ حاصل نہ کر سکا، معمولی و حقیر تھا، تو ہر گز وہ اضطراب اور نفسیاتی دباؤ کا شکار نہ ہوگا۔ قرآن کریم فرماتا ہے:

"قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَى" (27)

ترجمہ: "اے پیغمبر ﷺ! آپ کہہ دیجئے کہ دنیا کا مال و متاع تو بہت تھوڑا سا ہے اور آخرت صاحبانِ تقوی کے لئے بہترین جگہ ہے۔"

دنیا کی دوسری واقعیات میں سے ایک اور واقعیت، جو اُن میں سے اہم ترین بھی ہے، وہ دنیا میں موجود سختیاں اور مصیبتیں ہیں کہ جن کا ہدف و مقصد انسان کی آزمائش و امتحان ہے۔ اس واقعیت سے ہم آہنگ نہ ہونا، انسان پر سب سے زیادہ نفسیاتی دباؤ وارد کرتا ہے۔ نیز اسی طرح وحیانی عقیدے اور اُخروی نگاہ کے بغیر، اسٹریس و اضطراب کے اس قدر وزن کو تحمل نہیں کیا جا سکتا۔

امام علی علیہ السلام اس واقعیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"إِنَّ الدُّنْيا سَرِيعَةُ التَّحَوُّلِ كَثِيرَةُ التَّنَقُّلِ ۔ ۔ ۔ فَأَحوالُها تَتَنَزَّلُ وَنَعِيمُها يَتَبَدَّلُ وَرَخاؤُها يَتَنَقَّصُ وَلَذَّاتُها تَتَنَغَّصُ ۔ ۔ ۔" (28)

یعنی: "یقیناً دنیا تحوّل و دگرگونی کی سرعت اور جابجائی و انتقال کی کثرت رکھتی ہے۔ ۔ ۔ پس اس کی حالتیں تنزّل کا شکار اور اس کی نعمتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور اس کا راحت و سکون ناقص اور اس کی لذّتیں تھوڑی ہیں۔"

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض اَدیان اور اقوام نے اس واقعیت کی طرف توجہ رکھی ہے اور دنیا کو سختیوں اور مصیبتوں کا مقام قرار دیا ہے؛ لیکن ان کا نقطۂ نظر اسلام کے نقطۂ نظر سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ اُن اقوام کی نظر یہ ہے کہ دنیا آرام و سکون اور آسائش کے بغیر، ہمیشہ تنگ و تاریک اور مصیبتوں سے پُر ہے؛ لیکن اسلام کی نگاہ میں دنیا کی سختیاں، اس کے آرام و آسائش کے ہمراہ ہیں۔ اسلام کہتا ہے ہر سختی کے بعد، آسانیاں پائی جاتی ہیں۔ باوجود اس کے کہ سختیوں کو دیکھتے ہو، آرام و سکون بھی حاصل کر سکتے ہو۔

''فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا''

''یقیناً ہر سختی کے ساتھ آسانی ہے! (جی ہاں!) بے شک ہر سختی کے ساتھ آسانی ہے۔''

دوسری طرف ان مصیبتوں کو برداشت کرنے اور آرام و سکون تک پہنچنے کے لیے قرآنی راہِ حل دوسرے تمام راہِ حلوں کی نسبت صحیح تر اور واقع سے زیادہ نزدیک تر ہیں۔

کیونکہ دنیا مقامِ عمل اور آخرت مقامِ حساب (و جزاء) ہے، اس لیے خداوند عالم نے اس دنیا میں امتحانات و آزمائشیں قرار دیں ہیں، تاکہ انسان ان کے نتیجہ کو عالمِ حساب میں مشاہدہ کرے۔ جیسا کہ خداوند فرماتا ہے:

''إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا'' (29)

ترجمہ: ''بیشک ہم نے روئے زمین کی ہر چیز کو زمین کی زینت قرار دے دیا ہے تاکہ ان لوگوں کا امتحان لیں کہ ان میں سے عمل کے اعتبار سے سب سے بہتر کون ہے۔''

''الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ'' (30)

ترجمہ: ''وہ (خدا) جس نے موت و حیات کو اس لئے پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے حُسنِ عمل کے اعتبار سے سب سے بہتر کون ہے اور وہ صاحبِ عزّت اور بخشنے والا ہے۔''

اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ خداوند عالم کی ''آزمائش'' استعداد اور قابلیت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ اس استعداد کا ظاہر کرنا در حقیقت اس کو رُشد و تکامل دینا ہے۔ یہ آزمائش و امتحان موجود اسرار سے پردہ اُٹھانے کے لیے نہیں ہے، بلکہ ان پوشیدہ استعداد اور قابلتیوں کو ایک راز کی مانند مرحلۂ فعلیت بخشنے کے لیے ہے۔ یہاں پردہ اُٹھانا، کسی شئ کو ایجاد کرنا ہے۔ الٰہی آزمائش و امتحان، انسانی صفات کو پوشیدہ قوت و استعداد سے مرحلۂ فعلیت اور کمال کی جانب باہر لانا ہے۔ خداوند کی آزمائش، وزن کا پرکھنا نہیں، بلکہ وزن کا بڑھانا ہے۔ اس وضاحت کے ساتھ ظاہر ہو جاتا ہے کہ مذکورہ آیت کریمہ اسی حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ دنیا، استعداد اور قابلیتوں کی جائے پرورش اور انسانوں کی تربیت گاہ ہے۔ (31)

الٰہی آزمائش و امتحان، بندوں کے بارے میں تکمیل کنندہ کی حیثیت رکھتے ہیں:

''لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا'' (32)

ترجمہ: ''تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے حُسن عمل کے اعتبار سے سب سے بہتر کون ہے۔''

ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام الٰہی آزمائشوں کے فلسفہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اَلَا إِنَّ اللهَ تَعالَی قَدْ کَشَفَ الْخَلْقَ کَشْفَةً، لَا أَنَّهُ جَهِلَ ما اَخْفَوْهُ مِنْ مَصُونِ اَسْرَارِهِمْ وَمَکْنُونِ ضَمائِرِهِمْ وَلَکِنْ لِيَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً، فَيَکُونَ الثَّوابُ جَزَاءً وَالْعِقابُ بَوَاءً'' (33)

یعنی: ''آگاہ ہو جاؤ! کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے لوگوں کے باطن آشکارا کر دیئے ہیں، نہ اس وجہ سے کہ وہ پوشیدہ اسرار اور مخفی ضمیروں سے آگاہ نہیں تھا، بلکہ اس لیے کہ وہ اُن کو آزمائے کہ کون اُن میں سے بہتر عمل کرنے والا ہے، پس نیک عمل کی جزا، ثواب اور بُرے عمل کی سزا، عقاب ہے۔''

اس بارے میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

''إِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ لَيَتَعَاهَدُ الْمُؤْمِنَ بِالْبَلَاءِ کَمَا يَتَعَاهَدُ الرَّجُلُ أَهْلَهُ بِالْهَدِيَّةِ مِنَ الْغَيْبَةِ وَيَحْمِيهِ الدُّنْيَا کَمَا يَحْمِي الطَّبِيبُ الْمَرِيضَ'' (34)

یعنی: ''خداوند عزّوجل مومن کو مصیبت اور سختی کے ساتھ اسی طرح نوازتا ہے جس طرح کوئی شخص سفر سے واپسی پر اپنے اہل خانہ کو تحائف سے نوازتا ہے اور اُسے دنیا سے پرہیز کی اسی طرح نصیحت کرتا ہے جس طرح طبیب مریض کو پرہیز کی تاکید کرتا ہے۔''

سختیاں اور مشکلات جو خداوند تبارک و تعالیٰ دنیا میں انسان کے سامنے لاتا ہے، بلکہ قرآنِ کریم کی دوسری تعبیر میں، دنیا میں جو نعمتیں بھی انسان کے لیے ظاہر (اور عطا) ہوتی ہیں، یہ سب اس لیے ہیں کہ اس کی پوشیدہ استعداد اور قابلیتوں کو ظاہر کرے اور اُن کو قوت سے فعلیت کی طرف لے جائے۔

خداوند اس بارے میں فرماتا ہے:

''وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الأَمَوَالِ وَالأنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ'' (35)

ترجمہ: ''اور ہم یقینا تمہیں تھوڑے خوف، تھوڑی بھوک اور اموال، نفوس اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے اور اے پیغمبرؐ آپ ان صبر کرنے والوں کو بشارت دے دیں۔''

ضروری ہے کہ یہ سختیاں پیش آئیں اور ان سختیوں کے نتیجہ ہی میں انسان کے لیے صبر و استقامت اور پختگی و کمال پیدا ہوتے ہیں اور اس خوشخبری و بشارت کا موضوع واقع ہوتے ہیں۔

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ''جس قدر امتحان اور آزمائش بڑی ہوتی ہے اسی قدر ثواب اور پاداش زیادہ ہوتی ہے، مگر تم نہیں دیکھتے کہ خداوند سبحان نے گذشتگان کو، حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر اس جہاں کے آخری فرد تک سب کو ایسے پتھروں سے کہ جو نفع و نقصان نہیں پہنچاتے اور نہ دیکھ و سُن سکتے ہیں، آزمایا ہے اور پتھروں سے اپنا حرمت والا گھر (بیت اللہ الحرام) بنایا ہے وہ گھر جسے لوگوں (کی ہدایت و رہنمائی) کے لیے بلند قرار دیا ہے۔۔۔؟!

لیکن خداوند اپنے بندوں کو انواع و اقسام کی سختیوں کے ساتھ آزماتا ہے اور ان کو مختلف رنج و غم اور کوششوں کے ذریعے بندگی کی ترغیب دلاتا ہے اور بہت سی ناخوشگوار چیزوں سے اُن کا امتحان لیتا ہے تاکہ تکبّر اور نخوت کو ان کے دلوں سے باہر نکال دے اور عجز و انکساری کو ان کی روحوں میں قرار دے اور اس کو اپنے فضل و کرم اور بخشش کی جانب کھلا دروازہ اور اپنی عفو و درگذر اور بخشش کے لیے فراہم وسیلہ قرار دے۔'' (36)

یہاں شاید یہ نکتہ ذہن میں آئے کہ پس زندگی میں آرام و آسائش کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی دنیا کو تبدیل کریں یا کسی دوسری دنیا کی آرزو کریں اور اُسے بنائیں۔ حالانکہ ہم اسی دنیا میں آرام دہ اور اسٹریس سے دور زندگی کے حامل ہو سکتے ہیں؛ بشرط یہ کہ ہم اس کا راستہ جانتے ہوں اور اس کا ایک راستہ دنیا سے دل نہ لگانا (یعنی دنیا کا اسیر نہ ہونا) ہے۔ دینی تعلیمات میں دنیا کا دل بستہ اور اسیر نہ ہونا ''زُہد'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن نہ وہ تارکِ الدنیا ہونے والا زُہد اور نہ ہی فریب دینے والا زہد۔ اسلام نہ تو دنیا سے راہِ فرار اختیار کرنے اور تارکِ الدنیا ہو جانے کو کہتا ہے اور نہ ہی دنیا کا گرویدہ اور اسیر ہو جانے کو، بلکہ رنگِ آخرت اور رنگِ خدا اختیار کرنے کو کہتا ہے، دنیا کو خدا اور آخرت کی خاطر ترک کریں، نہ یہ کہ دنیا کو دنیا ہی کی خاطر ترک کریں، تاکہ خلافِ فطرت و عادت کام انجام دیں (جیسے: ریاضت کرنے والے ہندو پنڈت اور دوسرے منحرف فرقوں کا کام ہوتا ہے۔)

امام علی علیہ السلام اپنے پُر معنی جملوں میں دنیا کا دل بستہ اور اسیر نہ ہونے کو آرام و سکون اور راحتی کا موجب قرار دیتے ہیں:

''ثَمَرَةُ الزُّهْدِ الرَّاحَةُ'' (37) یعنی: ''زُہد کا پھل آسودگی اور راحت ہے۔''

''اَلزُّهْدُ فِي الدُّنْيا الرَّاحَةُ العُظْمى'' (38) یعنی: ''دنیا میں زُہد اختیار کرنا بڑی عظیم راحت ہے۔''

جو شخص یہ چاہتا ہے کہ (دنیا میں) آرام دہ و راحت زندگی گزارے، اُسے چاہیے کہ دنیا سے دل اُٹھالے۔ امام علی علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں:

"مَنْ اَحَبَّ الرَّاحَةَ فَلْيُوْثِرِ الزُّهْدَ فِي الدُّنْيا" (39)

یعنی: "جو راحت و سکون کو دوست رکھتا ہے، اُسے چاہیے کہ دنیا میں رُہد و پرہیزگاری کا انتخاب کرے۔"

روایات میں صراحت سے بیان ہوا ہے کہ رُہد، انسان کے جسم و جان کی آسائش کا موجب ہے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بارے میں فرماتے ہیں:

"اَلزُّهْدُ فِي الدُّنْيا يُرِيحُ الْقَلْبَ وَالْبَدَنَ" (40)

یعنی: "دنیا میں رُہد اختیار کرنا، قلب و بدن کو آسودہ خاطر کرتا ہے۔"

اس کے علاوہ، ایمان کی حلاوت و شیرینی کا مزہ چکھنا بھی دنیا میں زہد پر موقوف ہے۔ زندگی کی لذّتوں میں سے ایک، ایمان کی حلاوت کا مزہ چکھنا ہے۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم ہیں، وہ زندگی کی لذّتوں سے پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہوتے۔ ایمان کی حلاوت کا مزہ چکھنے اور زندگی کی لذّت سے بہرہ مند ہونے کا واحد راستہ، رُہد اور دنیا سے دل بستہ نہ ہونا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں:

"حَرَامٌ عَلَى قُلُوبِكُمْ أَنْ تَعْرِفَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ حَتَّى تَزْهَدَ فِي الدُّنْيا" (41)

یعنی: "تمہارے دلوں پر حرام ہے کہ ایمان کی شیرینی کو درک کر سکیں یہاں تک کہ دنیا سے دل اُٹھالیں۔"

۹۔ صحیح و سالم سماجی تعلقات

اسلام اضطراب اور نفسیاتی دباؤ سے مقابلے اور انسان کی اصلاح اور بہبودی کی افزائش کے لیے، علاوہ ازیں یہ کہ شناخت و معرفت کے طریقوں، جیسے: خدا پر ایمان، خدا پر توکّل اور مقدراتِ الٰہی پر اعتقاد و ایمان اور نیز معنوی روشوں، جیسے: دعا اور آئمہ علیہم السلام سے توسّل سے بہرہ مند ہونے کی بات کرتا ہے کہ جو فکر و اندیشہ کے ایجاد کرنے اور اس کی اصلاح یا انسان کو مشکلات اور نفسیاتی دباؤ سے مقابلہ کے لیے خدا اور اولیائے الٰہی کے ساتھ ایک قسم کا معنوی اور عاطفی رابطہ برقرار کرنے کے لیے آمادگی اور ترغیب و تشویق دلاتا ہے۔

نیز انسان کے اضطراب اور نفسیاتی دباؤ کو کم کرنے کے لیے اجتماعی، معاشرتی اور قرابتداری کی بنیاد پر تعلقات برقرار کرنے کی روشوں، جیسے: خاندان والوں، رشتہ داروں اور قرابتداروں کے ساتھ تعلقات استوار رکھنے کی بھی تشویق دلاتا ہے؛ کیونکہ جو شخص خاندانی اور معاشرتی حمایت کا حامل نہ ہو، وہ اپنے آپ کو نفسیاتی طور پر کسی تکیہ گاہ کے بغیر دیکھتا ہے، لیکن اگر انسان مختلف حوادث اور مشکلات سے رُوبرو ہوتے وقت مضبوط خاندانی تکیہ گاہ کا مالک ہو، تو خود کو قدر تمند خیال کرتا ہے اور اضطراب و نفسیاتی دباؤ کا شکار نہیں ہوتا اور تنہائی کا احساس بھی نہیں کرتا اور نفسیاتی دباؤ سے پیدا ہونے والی مختلف بیماریوں سے بھی بہت کم دوچار ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے معاشرتی تعلقات اور لوگوں کے ساتھ معاشرت، دینِ اسلام میں خاص اہمیت رکھتے ہیں اور دینی احکامات کا ایک بڑا حصہ اسی چیز کے ساتھ مخصوص ہے۔ واضح ہے کہ ایک صحیح و سالم سماجی تعلق، انسان اور معاشرے کے تمام دوسرے افراد کے درمیان آرام و سکون کے فراہم کرنے میں نہایت موثر کردار ادا کر سکتا ہے۔

دینِ مبین اسلام مختلف عناوین اور احکامات، جیسے: صلۂ رحمی، غصہ پی جانا، حُسنِ خُلق، خندہ روئی، مومنین کے ساتھ ہمنشینی، دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا، زکات و صدقہ دینا، دوسروں سے عفو و درگذر، تواضع و انکساری، مہمان نوازی، ادب و احترام، عزّتِ نفس، دوستی و ہم نشینی، صلح و صفا، راز داری، ایفاء عہد، صداقت و راستگوئی و۔۔۔ کے ساتھ صحیح و سالم اجتماعی تعلقات کی تاکید کرتا ہے۔ اس بارے میں مختلف کتابیں ''اخلاقِ معاشرت'' اور ''آدابِ معاشرت'' کے عنوان سے لکھی گئی ہیں، ہم یہاں ان میں سے کچھ کو بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

الف) صلۂ رحمی

انسان زندگی میں مشکلات و حوادث اور نفسیاتی دباؤ پیدا کرنے والے عوامل سے مقابلہ کے لیے، دو قسم کے عوامل کا محتاج ہے: ایک طبیعی و مادی اسباب اور دوسری مناسب زمانی شرائط۔ تکیہ گاہ کے نہ ہونے اور تنہائی کا احساس، بسا اوقات نفسیاتی تعادُل کے بگڑ جانے کا باعث بنتا ہے اور انسان کو اپنے ہدف و مقصد تک پہنچنے سے روک دیتا ہے اور عاجزی و ناتوانی اُس پر غلبہ کر لیتی ہے۔ صلۂ رحمی اور خاندانی تعلقات، تنہائی کے احساس کے ساتھ، کہ جو غیر محفوظ افراد کی علامتوں میں سے ایک ہے، مقابلہ کے لیے کھڑے

ہو جاتے ہیں اور لوگوں کو اپنے وسیع خاندان کے ساتھ مکمل امنیت و حفاظت کا احساس دلاتے ہیں، تاکہ مشکلات کے ظاہر اور نفسیاتی دباؤ کے پیدا ہونے کے موقع پر عمدہ طریقے سے ان کا سامنا کرے اور روحانی آرام و سکون اور نفسیاتی سلامتی حاصل کر سکے۔

خداوند عالم نے اس آیت میں اس مسئلے کو اس حد تک اہمیت دی ہے کہ ان کے نام کو اپنے نام کی صف میں قرار دیا ہے:

"یَا أَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُواْ رَبَّکُمُ الَّذِی خَلَقَکُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً کَثِیرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُواْ اللّهَ الَّذِی تَسَاءلُونَ بِهِ وَالأَرْحَامَ إِنَّ اللّهَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیبًا" (42)

یعنی: "اے انسانو! اپنے پروردگار (کی مخالفت) سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا ہے اور اس کا جوڑا بھی اسی کی جنس سے پیدا کیا ہے اور پھر ان دونوں سے بکثرت مرد و عورت (روئے زمین پر) پھیلا دیئے ہیں اور اس خدا سے بھی ڈرو جس کے ذریعہ ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قرابتداروں سے لاتعلّقی سے، بے شک اللہ تم سب کے اعمال پر نگران ہے۔"

امام علی علیہ السلام ایک خوبصورت حدیث میں صلۂ رحمی کی تشریح کرتے ہوئے اس کی اہمیت پر تاکید کرتے ہیں:

"۔۔۔ وَاعْطُفْهُم عَلَیهِ عِنْدَ نازِلَةٍ اِذا نزَلَتْ بِهِ۔۔۔" (43)

یعنی: "اے لوگو! کوئی بھی شخص خواہ جس قدر بھی ثروتمند کیوں نہ ہو، اپنے رشتہ داروں اور خاندان والوں اور ان کی اپنی نسبت عملی اور زبانی حمایت سے بے نیاز نہیں ہے۔ وہی وہ سب سے بڑا گروہ اور قبیلہ ہیں، جو انسان کی پشت پناہی کرتے ہیں اور اس کی پراکندگی اور پریشانی کو دور کرتے ہیں اور جو مصائب و حوادث بھی اُسے پیش آتے ہیں، سب سے زیادہ اس کے ساتھ مہربان اور ہمدرد ہوتے ہیں۔ وہ نیک نامی جو خداوند عالم لوگوں کو درمیان انسان کے لیے ظاہر کرتا ہے، اس مال و ثروت سے کہیں بہتر ہے کہ جو وہ دوسروں کے لیے باقی چھوڑتا ہے۔

آگاہ ہو جاؤ! کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنے ضرورتمند رشتہ دار سے رُخ پھیر لو اور اُسے تھوڑا سا معمولی مال دینے سے بھی دریغ کرو کہ اگر نہ دو تو کوئی چیز تمہاری ثروت میں زیادہ نہ ہوگی اور اگر دے دو تو تمہارے مال و ثروت سے کوئی چیز کم نہ ہوگی۔ جو کوئی اپنے رشتہ داروں سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے، تو اُن کا

ایک ہاتھ کم ہوتا ہے، لیکن یہ اپنے سے بہت سے ہاتھ دور کر دیتا ہے اور وہ شخص جو اپنی قبیلہ والوں اور رشتہ داروں سے نرم مزاج اور مہربان ہوتا ہے، اُن کی دائمی محبت اور دوستی کو حاصل کر لیتا ہے۔"

تنگدستی کا خوف، ناگہانی موت اور مصیبتیں، اسٹریس پیدا کرنے والے عوامل ہیں کہ جو صلہ رحمی کے ذریعہ برطرف ہو جاتے ہیں۔ جالب توجہ یہ ہے کہ صلۂ رحمی سے حاصل ہونے والا آرام و سکون، فقط مومنین اور نیک لوگوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ جو کوئی بھی اس کی رعایت کرے گا اس کے اثرات و فوائد کو دیکھے گا۔امام محمد باقر علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں:

"صِلَةُ الْأَرْحَامِ تُزَكِّي الْأَعْمَالَ وَتُنْمِي الْأَمْوَالَ وَتَدْفَعُ الْبَلْوَى وَتُيَسِّرُ الْحِسَابَ وَتُنْسِئُ فِي الْأَجَلِ" (44)

یعنی: "صلۂ رحمی اعمال کو پاکیزہ، اموال کو زیادہ، بلاء و مصیبت کو دور، حساب و کتاب کو آسان اور موت کو مؤخر کر دیتی ہے۔"

جو چیز سب سے زیادہ صلۂ رحمی کے اثرات میں بیان ہوئی ہے وہ طولِ عمر اور روزی کی فراوانی ہے اور یہ چیز شاید اس وجہ سے ہے کہ لوگ اپنے آپ کو معاشرتی حمایت کے ایک وسیع پلیٹ فارم پر دیکھتے ہیں اور اپنے عواطف اور جذبات کا ایک دوسرے کی نسبت اظہار کرتے ہیں؛ اس لیے ان کی بہت سی طبیعی ضرورتیں، جیسے: محبت، خود نمائی، گروہ سے وابستگی و۔۔۔ پوری ہو جاتی ہیں اور اس لحاظ سے کہ انسان کی روح اور نفسیات اس کے جسم پر گہرا اثر چھوڑتی ہیں، صلۂ رحمی اور نفسیاتی آرام و سکون کے عمیق تعلق اور اس کے اثر کو انسان کی طولانی عمر میں دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس بات کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ جس قدر صلۂ رحمی انسان کی نفسیاتی اور عاطفی حمایت میں موثر ہوتی ہے اور طولِ عمر کا باعث بنتی ہے، قطعِ رحمی بھی اسی قدر نفسیاتی حمایت کے نہ ہونے، اسٹریس اور نفسیاتی دباؤ کا موجب بنتی ہے اور جسم کی کمزوری اور عمر کے گھٹنے پر تمام ہوتی ہے۔

ب) غیظ و غضب پر کنٹرول

غیظ و غضب، یقیناً اضطراب اور نفسیاتی دباؤ کے اہم ترین عوامل میں سے ایک ہے کہ جو ایک خصلت کی صورت میں تبدیل ہو کر انسان کو ہلاک اور اس کی زندگی کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ اس لیے دین مبین اسلام کے احکامات میں غصہ کے پی جانے پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

اس بُری خصلت کی مذمّت میں یہی کافی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''اَلغَضَبُ مِفتَاحُ کُلِّ شَرٍّ'' (45) یعنی: ''غصہ ہر برائی کی چابی ہے۔''

امام علی علیہ السلام ایک روایت میں، غصہ سے حاصل ہونے والی ناراحتی اور نفسیاتی دباؤ کو صراحت سے بیان کرتے ہیں اور اس چیز کو نفسیاتی و روحانی شکنجہ کا موجب قرار دیتے ہیں:

''مَنْ غَضِبَ عَلَی مَنْ لَا یَقْدِرُ عَلَی مَضَرَّتِہِ طَالَ حُزْنُہُ وَعَذَّبَ نَفْسَہُ'' (46)

یعنی: ''جو شخص اُس پر غضبناک ہو کہ جس کو وہ نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا، تو اُس کا حزن وملال طولانی ہوا اور اُس نے اپنے آپ کو عذاب دیا۔''

اس لیے آپؑ غصہ اور غضب کے علاج کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ضَبْطُ النَّفْسِ عِنْدَ حادِثِ الْغَضَبِ یُؤمِنُ مَواقِعَ الْعَطَبِ'' (47)

یعنی: ''غیظ و غضب کے وقت نفس پر قابو رکھنا، ہلاکت کے مقامات سے محفوظ رکھتا ہے۔''

جو شخص اپنے غصے پر قابو پالے، وہ شیطان پر کامیاب ہو جاتا ہے اور جو کوئی اپنے غصے کے سامنے مغلوب ہو جائے، تو شیطان اس پر کامیاب ہو جاتا ہے۔

ج) دوسروں سے حسد نہ کرنا

نفسیاتی دباؤ میں ڈالنے والی خصلتوں میں سے ایک حسد کرنا ہے جو ہمیشہ انسان کو نفسیاتی ناراحتی سے دوچار کرتی ہے اور اس سے آرام وسکون کو سلب کرلتی ہے۔ یہ پست صفت، اسلام کے احکامات میں بڑی شدّت کے ساتھ مورد مذمّت واقع ہوئی ہے۔ آرام و سکون اور آسائش کا سلب ہونا، ناراحتی، نفسیاتی دباؤ، شدید فکری اُلجھنوں و۔۔۔ حسد کرنے کی اہم ترین آفات شمار ہوتی ہیں۔ یہ دباؤ اس حد تک زیادہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے انسان کو ہر اُس کام پر مجبور کردے کہ جس سے بظاہر وہ آرام وسکون حاصل کرے۔ یہاں تک کہ اپنے بھائی کو قتل کردے۔ جیسا کہ قابیل نے اپنے بھائی (ہابیلؑ) سے حسد کی وجہ سے اُسے قتل کیا اور یوسفؑ کے بھائیوں نے انہیں مارا پیٹا اور کنویں میں پھینک دیا۔

حسد دو لحاظ سے اضطراب اور نفسیاتی تشویش کا باعث ہو سکتا ہے: ایک یہ کہ خود حسد رنج دینے والا ہے؛ دوسرے یہ کہ حسد ایسے گناہوں اور کاموں کو موجب بن سکتا ہے کہ جو تشویش اور اضطراب کا سبب بنتے ہیں۔ بہت سے گناہوں، جیسے: قتل اور دیگر سنگین جرائم کی وجہ حسد کرنا ہی ہے۔

"وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِن أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الآخَرِ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ" (48)

ترجمہ: "اور پیغمبر ﷺ آپؐ ان کو آدم علیہ السلام کے دونوں فرزندوں کا سچّا قصّہ پڑھ کر سنایئے کہ جب دونوں نے قربانی دی اور ایک کی قربانی قبول ہو گئی اور دوسرے کی نہ ہوئی تو اس نے کہا کہ میں تجھے قتل کردوں گا تو دوسرے نے جواب دیا کہ میرا کیا قصور ہے خدا صرف صاحبانِ تقوٰی کے اعمال قبول کرتا ہے۔"

اس لحاظ سے کہ حسد کی حالت، حسد کئے جانے والے شخص (محسود) سے نفرت، اُسے اذیت و آزار دینے اور اس پر زیادتی کرنے پر جا کر ختم ہوتی ہے، اس لیے خداوند عالم ہم سے چاہتا ہے کہ حاسد افراد کے شرّ سے بچنے کے لیے اس کی پناہ طلب کریں: "وَمِن شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ" (49) یعنی: "اور ہر حسد کرنے والے کے شرّ سے (بچا) جب وہ حسد کرے۔" (50)

حسد کرنے والا، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور فضیلتوں کے مقابلہ میں کھڑا ہوتا ہے اور الٰہی بخششوں پر اعتراض کرتا ہے۔ اس وجہ سے حاسد ہمیشہ نفسیاتی دباؤ میں زندگی گزارتا ہے؛ کیونکہ الٰہی بخششیں اور نعمتیں ہمیشہ جاری رہنے والی ہیں۔ خداوند متعال منافقین کا وصف بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ۔۔۔" (51)

ترجمہ: "اگر تمہیں ذرا بھی نیکی اور اچھائی (فتح و کامرانی) ملتی ہے، تو انہیں برا لگتا ہے (اور وہ ناراحت ہو جاتے ہیں)۔۔۔"

امام علی علیہ السلام حاسد شخص کی نفسیاتی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"يَكْفِيكَ مِنَ الحَاسِدِ اَنَّهُ يَغْتَمُّ وَقْتَ سُرُورِكَ" (52)

"تیرے لیے حسد کرنے والے سے یہی کافی ہے کہ تیری خوشی کے وقت وہ غمگیں ہوتا ہے۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لَا رَاحَةَ لِحَسُودٍ" (53) یعنی: "حسد کرنے والے کے لیے کوئی راحت و سکون نہیں ہوتا۔"

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "اَلْحَسَدُ يُنْشِئُ الْكَمَدَ" (54) یعنی: "حسد غم واندوہ پیدا کرتا ہے۔"

حسد کی آفت فقط انسان کی نفسیات کے ساتھ ہی منحصر نہیں ہے، بلکہ اس کے جسم کو بھی برباد کرتی ہے۔ حاسد کی جسمانی رنجش درحقیقت نفسیات کے جسم کے ساتھ مرتبط ہونے کے سبب ہے۔ اس زمانے میں یہ حقیقت مسلّم ہو چکی ہے کہ جسمانی بیماریاں، بہت سے موارد میں، نفسیاتی عامل رکھتی ہیں اور آجکل کی میڈیکل سائنس (طبّ) میں بڑی مفصّل ابحاث "روحانی جسمانی امراض" کے عنوان سے نظر آتی ہیں کہ جو اس قسم کی بیماریوں سے اختصاص رکھتی ہیں۔ امام علی علیہ السلام ایک خوبصورت جملہ میں حسد کے انجام کی طرف اشارہ فرماتے ہیں: "لِلّٰهِ دَرُّ الْحَسَدِ مَا اَعْدَلَهُ! بَدَاَ بِصَاحِبِهِ فَقَتَلَهُ" (55) یعنی: "شاباش حسد پر کہ کتنا عادل و باانصاف ہے! کہ جو سب سے پہلے اپنے صاحب ہی کو مار ڈالتا ہے۔"

اور ایک دوسری حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں: "اَلْحَسَدُ يُضْنِي الْجَسَدَ" (56) یعنی: "حسد بدن کو فرسودہ اور بیمار کر دیتا ہے۔"

حوالہ جات

1۔ملاحظہ فرمائیں: رضایت از زندگی، ص۸۷

2۔غرر الحکم، حدیث۷۲۱۸

3۔بحار الانوار، ج۷۳، ص۱۶۷، حدیث۳۱

4۔الارشاد فی معرفۃ حجج اللہ علی العباد، محمد بن نعمان عکبری بغدادی (شیخ مفیدؒ)، ج۱، ص۳۰۰

5۔بحار الانوار، ج۴۶، ص۲۳۰، حدیث۷

6۔غرر الحکم، حدیث۷۳۰۱

7۔سابقہ حوالہ، حدیث۷۲۴۷

8۔غرر الحکم، حدیث۷۲۹۸

9۔سورۂ معارج، آیت۱۹-۲۰

10۔تنبیہ الخواطر، ج۱، ص۱۶

11۔الخصال، ص۶۲۴، حدیث۱۰

12۔غرر الحکم، حدیث۵۶۱۲

13۔سابقہ حوالہ، حدیث۵۶۲۶

14۔سابقہ حوالہ، حدیث۵۶۳۸

15۔سابقہ حوالہ، حدیث۵۶۲۶

16۔تنبیہ الخواطر، ج۱، ص۸۷

17۔غرر الحکم، حدیث۶۲۹۲

18۔سابقہ حوالہ، حدیث۶۲۹۴

19۔رضایت از زندگی، ص۲۳

20۔کنز العمال، ج۳، ص۱۹۴، حدیث۶۱۳۰

21۔شرح نہج البلاغۃ، عزّ الدین ابو حامد ابن ابی الحدید المعتزلی، ج۲۰، ص۲۷۱، حدیث۱۳۷

22۔غرر الحکم، حدیث۲۲۵۸

23 ۔ ملاحظہ فرمائیں: سورۂ دخان، آیت ۵۱-۵۷

24۔ رضایت از زندگی، ص ۲۹

25۔ الأمالی، محمد بن علی بن حسین بن بابویہ قمی معروف بہ شیخ صدوقؒ، ص ۱۱۰

26۔ تنبیہ الغافلین، ابولیث نصر بن محمد سمرقندی، ص ۲۳۸، حدیث ۳۰۹

27۔ سورۂ نساء، آیت ۷۷

28۔ غرر الحکم، حدیث ۲۳۲۵

29۔ سورۂ کہف، آیت ۷

30۔ سورۂ ملک، آیت ۲

31۔ مجموعہ آثار، عدل الٰہی، شہید مرتضیٰ مطہریؒ، قم، صدرا، ج ۱، ص ۱۸۲

32۔ سورۂ ملک، آیت ۲

33۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۴۴

34۔ الکافی، ج ۲، ص ۲۵۵، حدیث ۱۷

35۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۵۵

36 ۔ ”كُلَّمَا كَانَتِ الْبَلْوَى وَالِاخْتِبَارُ أَعْظَمَ كَانَتِ الْمَثُوبَةُ وَالْجَزَاءُ أَجْزَلَ، أَلَا تَرَوْنَ أَنَّ اللهَ سُبْحَانَهُ اخْتَبَرَ الْأَوَّلِينَ مِنْ لَدُنْ آدَمَ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيْهِ إِلَى الْآخِرِينَ مِنْ هَذَا الْعَالَمِ بِأَحْجَارٍ لَا تَضُرُّ وَلَا تَنْفَعُ وَلَا تُبْصِرُ وَلَا تَسْمَعُ، فَجَعَلَهَا بَيْتَهُ الْحَرَامَ الَّذِي جَعَلَهُ لِلنَّاسِ قِيَاماً۔۔۔؟! وَلَكِنَّ اللهَ يَخْتَبِرُ عِبَادَهُ بِأَنْوَاعِ الشَّدَائِدِ وَيَتَعَبَّدُهُمْ بِأَلْوَانِ الْمَجَاهِدِ وَيَبْتَلِيهِمْ بِضُرُوبِ الْمَكَارِهِ؛ إِخْرَاجاً لِلتَّكَبُّرِ مِنْ قُلُوبِهِمْ وَإِسْكَاناً لِلتَّذَلُّلِ فِي نُفُوسِهِمْ وَلِيَجْعَلَ ذَلِكَ أَبْوَاباً فُتُحاً إِلَى فَضْلِهِ وَأَسْبَاباً ذُلُلاً لِعَفْوِهِ۔۔۔“ (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۲)

37۔ غرر الحکم، حدیث ۶۰۷۹

38۔ سابقہ حوالہ، حدیث ۶۰۷۷

39۔ سابقہ حوالہ، حدیث ۶۰۸۰

40۔ نثر الدرّ، منصور بن حسین آبی، ج ۱، ص ۱۷۰

41 ۔ تنبیہ الخواطر، ج ۲، ص ۱۹۱

42۔ سورۂ نساء، آیت ۱

43۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۲۳

44۔الکافی، الکلینیؒ، ج۲، ص۱۵۰، ح۴؛ نیز ملاحظہ فرمائیں: الأمالی، شیخ طوسیؒ، ص۴۸۱، حدیث۱۰۴۹

45۔الکافی، ج۲، ص۳۰۳، حدیث۳

46۔غرر الحکم، حدیث۸۷۲۸

47۔سابقہ حوالہ، حدیث۵۹۳۱

48۔سورۂ مائدہ، آیت۲۷

49۔سورۂ فلق، آیت۵

50۔قرآن و روانشناسی، نجاتی محمد عثمان، ص۱۳۶-۱۴۰

51۔سورۂ آل عمران، آیت۱۲۰

52۔کنز الفوائد، محمد بن علی الکراجکی الطرابلسی، ج۱، ص۱۳۷

53۔بحار الانوار، ج۷۳، ص۲۵۲، حدیث۱۲

54۔غرر الحکم، حدیث۱۰۳۸

55۔میزان الحکمۃ، ج۳، ص۱۰۰، حدیث۴۰۶۶

56۔غرر الحکم، حدیث۹۴۳

منابع و مأخذ

1۔قرآن کریم

2۔الارشاد فی معرفۃ حجج اللہ علی العباد، محمد بن نعمان عکبری بغدادی (شیخ مفیدؒ)، تحقیق: علی اکبر غفاری، قم، کنگرہ شیخ مفیدؒ، طبع اول ۱۴۱۳ھ ق

3۔الأمالی، محمد بن حسن الطوسیؒ، مؤسسہ البعثہ، قم، دار الثقافۃ، ۱۴۱۴ق

4۔الأمالی، محمد بن علی بن حسین بن بابویہ قمی معروف بہ شیخ صدوقؒ، بیروت مؤسسہ اعلمی، ۱۴۰۰ھ ق

5۔آئین زندگی، ڈیل کارنگی، ترجمہ: جہانگیر افخمی، تہران، ارمغان، ۱۳۷۶ شمسی

6۔بحار الانوار الجامعۃ لدرر اخبار ائمۃ الاطہارؑ، محمد باقر مجلسیؒ، بیروت، دار احیاء التراث، ۱۴۱۲ھ ق

7۔بہداشت روان در اسلام، سید مہدی صانعی

8۔التحقیق فی کلمات قرآن الکریم، حسن مصطفوی، وزارتِ ارشاد اسلامی، ۱۳۶۵ شمسی

9۔تفسیر القرآن العظیم (تفسیر ابن کثیر)، اسماعیل بن عمرو ابن کثیر دمشقی، محمد حسین شمس الدین، دار الکتب العلمیۃ، منشورات محمد علی بیضون، بیروت، ۱۴۱۹ھ ق

10۔تنبیہ الخواطر و نزہۃ النواظر (مجموعۃ ورام)، ابو الحسین ورّام بن ابی فراس، بیروت، دار التعارف، بدونِ تاریخ

11۔تنبیہ الغافلین، ابو لیث نصر بن محمد سمرقندی، تحقیق: یوسف علی بدیوی، بیروت، دار ابن کثیر، ۱۴۱۳ھ ق

12۔خدا در ناخود آگاہ، ویکتور فرانکل، ترجمہ و توضیح: ابراہیم یزدی، تہران، خدمات فرہنگی رسا، ۱۳۷۵ شمسی

13۔ الخصال، محمد بن علی بن حسین بن بابویہ قمی معروف بہ شیخ صدوقؒ، تحقیق: علی اکبر غفاری، بیروت، مؤسسہ الاعلمی للمطبوعات، ۱۴۱۰ھ ق
14۔ رضایت از زندگی، عباس پسندیدہ، قم، دار الحدیث، طبع پنجم ۱۳۸۶ شمسی
15۔ رفتارہای بہنجار و ناہنجار در کودکان و نوجوان، ڈاکٹر ثوائی نژاد، شکوہ، سازمان انتشاراتی و فرہنگی ابتکار ہنر، طبع چہارم ۱۳۷۰ شمسی
16۔ روانشناسی سلامت (۲)، ام۔ رابین دیماتئو
17۔ روانشناسی مرضی تحولی از کودکی تا بزرگسالی، ڈاکٹر پریرخ دادستان، تہران، سازمان مطالعہ وتدوین کتب علوم انسانی دانشگاہ ہا (سمت)، طبع سوم ۱۳۷۸ شمسی،
18۔ رویکردی انتقادی بہ خاستگاہِ دین از نگاہ فروید، غلام حسین توکلی، تہران، دفتر پژوہش و نشر سہروردی، ۱۳۷۸ شمسی
19۔ شرح نہج البلاغۃ، عزّالدین ابو حامد ابن ابی الحدید المعتزلی، بیروت، مؤسسہ الاعلمی للمطبوعات، بدون تاریخ
20۔ عیون الحکم والمواعظ، ابوالحسن علی بن محمد اللیثی الواسطیؒ، تحقیق: حسین حسنی بیرجندی، قم، دارالحدیث، ۱۳۷۶ شمسی
21۔ غررالحکم ودررالکلم، عبدالواحد الآمدی التمیمیؒ، تحقیق: محدث ارموی، جامعۃ طہران، ۱۳۶۰ شمسی
22۔ فرہنگِ قرآن، ہاشمی رفسنجانی اکبر ومحقّقان مرکز فرہنگ ومعارف قرآن کریم، قم، مؤسسہ بوستان کتاب قم، ۱۳۸۶ شمسی
23۔ فرہنگِ معین، محمد معین، تہران، امیر کبیر، طبع بیست وسوم ۱۳۸۵ شمسی
24۔ فرہنگِ واژہ ہا، تعاریف واصطلاحات تعلیم وتربیت، سید داوود حسینی نسب واصغر علی اقدم، تبریز، احراز، ۱۳۷۵ شمسی
25۔ قرآن ور وانشناسی، محمد عثمان نجاتی، ترجمہ: عباس عرب، مشہد، بنیاد پژوہش ہای اسلامی آستان قدس رضوی، ۱۳۷۶ شمسی
26۔ قصص الانبیاءؑ، سعید بن عبداللہ (قطب الدین راوندی)، تحقیق: غلام رضا عرفانیان، مشہد مقدس، مرکز پژوہش ہای اسلامی آستان قدس رضوی، ۱۴۰۹ھ ق
27۔ الکافی، محمد بن یعقوب بن اسحاق الکلینی الرازیؒ، تحقیق: علی اکبر غفاری، تہران، دار الکتب الاسلامیہ، ۱۳۸۹ھ ق
28۔ کنز العمال فی سنن الاقوال و الافعال، علاء الدین علی المتقی ابن حسام الدین الھندی، بیروت، مکتبۃ التراث الاسلامی، الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۹۷ھ ق
29۔ کنزالفوائد، محمد بن علی الکراجکی الطرابلسی، بہ کوشش: عبداللہ نعمت، قم، دار الذخائر، ۱۴۱۰ھ ق
30۔ لسان العرب، ابوالفضل محمد بن مکرم بن منظور الافریقی المصری، بیروت، دار احیاء التراث العربی، طبع سوم
31۔ مجموعہ آثار، عدل الٰہی، شہید مرتضیٰ مطہریؒ، قم، صدرا
32۔ معجم مفردات الفاظ القرآن، راغب اصفہانی، تحقیق: صفوان عدنان داوودی، قم، طلیعۃ النور، ۱۴۲۶ھ ق
33۔ مکارم الاخلاق، فضل بن حسن الطبرسیؒ، تحقیق: علاء آل جعفر، قم، مؤسسہ نشر اسلامی، ۱۴۱۴ھ ق
34۔ میزان الحکمۃ، محمد محمدی ری شہری، قم، دار الحدیث، ۱۴۱۶ھ ق
35۔ نثر الدرّ، منصور بن حسین آبی، تحقیق: محمد علی قرنہ، مصر، مرکز تحقیق التراث، تاریخ اشاعت: ۱۹۸۱ء
36۔ نہج البلاغہ، سید رضیؒ، ترجمہ: محمد دشتی و فیض الاسلام

*****

امت مسلمہ کے زوال اور انحطاط کے اسباب امام خمینیؒ کی نظر میں

محمد فرقان*

m.furqan512@yahoo.com

کلیدی کلمات: اُمت مسلمہ، تفرقہ، انحطاط وزوال، علمائے دین، سامراجی طاقتیں، سیاسی بحران

خلاصہ

معاشروں کے اجتماعی قانون کے تحت اُمت مسلمہ کے زوال کو ایک عرصہ دراز ہو چکا ہے اور آج اس نے مغربی طاقتوں کے سامنے اپنا سیاسی اقتدار کھو دیا ہے۔ جس کا اعتراف تمام مسلمان طبقات کر رہے ہیں۔ لیکن موجود صدی میں ایک بے مثال سیاسی شخصیت حضرت امام خمینیؒ نے اپنے قرآنی اور الہامی تفکر کی وجہ سے مسلمانوں کو اس زوال سے نکالنے اور عزت وشرف کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے جدوجہد کی ہے۔ اُنھوں نے اُمت مسلمہ کے زوال کے اسباب بیان کرکے اُنہیں اس ذلت آمیز صورت حال سے نکلنے کا راستہ دکھایا ہے۔

امامؒ کے نزدیک اُمت مسلمہ کے زوال کے پانچ اہم اسباب ہیں جن کی طرف اگر مسلمان متوجہ ہو جائیں اور ان کا سدباب کرلیں تو وہ اس صورت حال سے بہت جلد نکل سکتے ہیں۔ پہلا سبب اُمت کا تفرقہ اور اختلاف ہے، پھر سیاسی نظام کا فقدان ہے جس کی وجہ سے مسلمان سیاسی بحران کا شکار ہیں۔ تیسرا استعماری طاقتیں ہیں جو مسلمانوں کے زوال کے اسباب فراہم کر رہی ہیں۔ چوتھے مسلمانوں کا قرآنی ثقافت اور سیاست سے دور ہونا ہے اور پھر علمائے دین کا منفی کردار بھی مسلمانوں کو شکست وذلت سے دوچار کر رہا ہے۔

*۔ اسٹوڈنٹ ایم۔ فل۔ تاریخ تمدن اسلامی، مجتمع آموزش عالی امام خمینی، جامعۃ المصطفیٰ العالمیہ، قم، ایران۔

موضوع کا پس منظر اور ضرورت

اقوامِ عالم اپنے تاریخی سفر میں ہمیشہ ایک جیسے حالات اور یکساں صورتحال میں نہیں رہیں، بلکہ ان میں عروج و زوال، اور فراز و نشیب آتے ہی رہے ہیں۔ امت مسلمہ ایک عظیم الشان تاریخی پس منظر رکھنے کے باوجود عرصہ دراز سے اپنا سیاسی اقتدار کھو بیٹھی ہے اور بیرونی بالخصوص مغربی طاقتوں کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اپنی ذلت و رسوائی کا تماشا سب اہل دنیا کو دکھا رہی ہے۔ آج ہمارے سیاستدان اور مقتدر طبقے سے لے کر پڑھے لکھے روشن فکر طبقے تک سب ہی کسی نہ کسی انداز میں اپنے آپ کو مغربی دنیا کا مقروض سمجھتے ہیں، اور امت مسلمہ میں انہیں کسی خاص بڑی پیشرفت اور ترقی کی راہ نظر نہیں آتی، فقر و فلاکت اپنی جگہ، علمی اور معنوی اعتبار سے بھی دنیائے اسلام اس وقت ناگفتہ بہ صورتحال میں مبتلا ہے۔

ایک انقلابی رہنما کا سب سے بڑا کمال، معاشرے کے نشیب و فراز سے مکمل واقفیت کے ساتھ ساتھ وقت کی نزاکتوں اور زمانے کے تقاضوں کی مکمل جان پہچان ہوتی ہے تاکہ وہ معاشرے کی ادبیات اور اس کی زبان میں بات کرسکے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ امام خمینیؒ ایک عظیم سیاسی لیڈر ہونے کے علاوہ، ہماری صدی کی بے مثال دینی شخصیت ہیں، ایک ایسی شخصیت جس کا تفکر الہامی اور سوچ قرآنی ہے۔ فقہ اور فقاہت کے میدان میں مہارت اپنی جگہ، آپ کو معاشرے کی پرکھ اور پہچان اس حد تک تھی کہ پورے ایران کی نبض گویا آپ کے اذن سے دھڑکتی تھی۔ یہ آپ کی معنوی طاقت ہی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ آپ کی گہری سوچ اور عمیق جانچ اور پرکھ تھی جس کے بل بوتے پر آپ نے بہت بڑی انسانی طاقت کو حرکت میں لایا اور ایک عظیم انقلاب۔ جو اس صدی کا بے مثال کرشمہ تھا۔ لانے میں بنیادی اور مرکزی کردار ادا کیا۔ یقیناً ایسا انسان اُمت مسلمہ کے دکھ درد اور مصائب و آلام سے اچھی طرح واقف اور آگاہ تھا۔

تاہم آپ کے تفکر پر لکھے جانے والے لٹریچر کی چھان بین کرنے پر اس بات کا اندازہ لگانے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ مختلف معاشرتی موضوعات کے حوالے سے آپ کے افکار اور آراء کے تجزیاتی مطالعے کا میدان بالکل خالی ہے، بالخصوص اُمت مسلمہ کے حالات، مسائل اور مشکلات کے تجزیاتی مطالعہ کی شدید کمی کا احساس شدت سے ہوا، اردو زبان میں تو اس قسم کا لٹریچر بالکل ہی ناپید ہے، البتہ فارسی میں کسی حد تک اس حوالے سے کاوشیں ہوئی ہیں جو اپنے تئیں لائق تقدیر ہیں، اگرچہ ان میں بھی تجزیے اور تحلیل کی کمی اور نقلِ قول پر بھروسہ زیادہ دیکھنے کو ملا ہے۔

اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ آپ کے ان افکار کو جو انہوں نے مختلف معاشرتی میدانوں میں پیش کیے ہیں، کا مطالعہ کرکے ان کا دقیق علمی جائزہ لیا جائے اور اس کے بل بوتے پر نظریات قائم کیے جانے چاہیں۔ اس کام کے لیے سب سے پہلے مرحلے میں، آپ کے بکھرے اور پراگندہ کلام کو موضوعاتی انداز میں اکٹھا کیا جائے، اگلے مرحلے میں اسے خاص نظم و قاعدے کے تحت ترتیب دے کر، اس پر صحیح انداز میں تجزیہ و تحلیل کی جائے تاکہ اس کے اندر موجود پراگندگی اور بکھرے پن کا خاتمہ کرکے اس میں ارتباط اور یکجہتی قائم کی جاسکے اور عملی طور پر صحیح نتائج سامنے لائے جاسکیں۔
یہ نتائج یقیناً کارآمد اور قابل عمل ہونگے اور خاکسار کی رائے میں انشاء اللہ ان پر عمل کے ذریعے امت مسلمہ کی مشکلات کا خاتمہ بھی ممکن ہوگا، کیونکہ وقت نے ثابت کر دیا کہ امام خمینیؒ کی رائے میں پایا جانے والا جزم اور استحکام آپ کی سوچ کے اندر پائے جانے والے استحکام کا عکاس تھا، اس خاطر ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اجتماعی اور معاشرتی مسائل اور مشکلات کے راہ حل اگرچہ قطعی نہیں ہوتے، تاہم امام خمینیؒ کے پیش کردہ نظریات کی حقانیت اور سچائی کا اندازہ۔قرآن و سنت کی روشنی اور الٰہی قوانین کے آئینے میں ۔لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اور یوں ان سے عملی فائدہ حاصل کرنا یقینا آج کے مسلم معاشرے کی اہم ضرورت ہے۔
ان معاشرتی موضوعات میں سے ایک موضوع ۔جو وقت کی اہم ضرورت بھی ہے۔ امت مسلمہ کے زوال و انحطاط کے اسباب سے متعلق ہے۔ امت مسلمہ دن بدن ایک خاص قسم کی مشکل میں مبتلا ہوتی جا رہی ہے، آئے دن اسلامی معاشرے کے اندر نت نئے مسائل جنم لے رہے ہیں۔ تکفیریت اور وہابیت ایک وبائی مرض کی طرح اہل سنت کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ معاشرہ میں تحمل اور برداشت نام کی چیز نہیں ہے۔ شیعہ اور اہل سنت کے اندر پائے جانے والی سیاسی، فکری، عقیدتی اور معاشرتی مشکلات کو اگر گننے بیٹھ جائیں تو لمبی فہرست سامنے آئے گی۔ اس صورتحال میں سوال یہ اٹھتا ہے وہ کونسے بنیادی مسائل اور مشکلات ہیں جن کے باعث اُمت مسلمہ آج اس قدر مصائب کا شکار ہے؟
ہماری زبوں حالی جس پر سید جمال الدین، علامہ اقبال، شہید مطہری، شہید قطب، سید مودودی اور دیگر متفکرین روتے ہوئے اس دنیا سے گئے، اس کی اصل وجہ کیا ہے؟ دوسرے لفظوں میں: اگر ہم ان مشکلات کو ایک شجرہ خبیثہ سے تشبیہ دیں جس کی مختلف شاخیں اسلامی دنیا کے ہر کونے تک پہنچ چکی

ہوں، تو سوال اس شجرہ خبیثہ کی جڑوں سے متعلق ہے؟ یہ تحریر اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے درپے ہے کہ امام خمینیؒ جیسے عظیم انقلابی مفکر کے نزدیک امت مسلمہ کی مشکلات کے علل واسباب کیا ہیں؟

حرف آغاز

سب سے پہلے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ اجتماعی آفات اور مسائل کبھی بھی علت واحدہ کے تابع نہیں ہوتے، ہمیشہ معاشرے کی سطح پر رونما ہونے والے واقعات کے کئی ایک اسباب ہوتے ہیں، لہٰذا خاص طور پر کسی ایک علت کی طرف انگشت نمائی کرنا اپنی نادانی کا برملا اعتراف کرنا ہے۔

ہاں یہ بات قابل قبول ہے کہ بعض اسباب کا وضوح دیگر عوامل کو تحت الشعاع قرار دیتا ہے، اس لیے ان کی طرف توجہ نہ کرنا یا کم توجہ کرنا شاید ایک قدرتی امر ہو۔ یہ سلسلۂ علل واسباب، طولی حیثیت کا حامل ہوتا ہے یعنی: ہر علت مستقل عمل کرنے کی بجائے ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے زنجیر کے حلقوں کی مانند حتمی نتیجے تک لے جاتی ہے۔ اس لیے علل واسباب کے متعلق جدا جدا بحث کرنا کافی دقت طلب مسئلہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ ہر سبب اپنے لحاظ سے مسبّب ہی ہوتا ہے کسی اور علت کا اور اس سے متاثر ہوتا ہے، اور یوں علت العلل کا پیش کرنا مشکل ہو جاتا ہے، مسائل اور مشکلات کا مجموعہ دیگر مشکلات کے پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے۔ یعنی مسائل ایک دوسرے کو جنم دیتے ہیں اور تاثیر و تاثر اور عمل ورد عمل کا یہ سلسلہ باعث بنتا ہے کہ کچھ دیگر مسائل معاشرتی سطح پر بھی ظاہر ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ امام خمینیؒ نے امت مسلمہ کی مشکلات کو بیان کرتے ہوئے بعض اوقات خاص علاقے یا خطے۔مثلاً فلسطین۔ کی طرف توجہ مرکوز کی ہے، لہٰذا اگرچہ یہ امر اس بات کی طرف بھی اشارہ کر سکتا ہے کہ وہ مشکل اس علاقے میں خاص طور پر موجود ہے، لیکن اس کی عمومیت بھی اپنی جگہ محفوظ ہے۔

ذیل میں ہم ان اسباب کا ذکر کریں گے جو امت مسلمہ کے زوال و انحطاط کا باعث بنے ہیں۔ جس ترتیب سے ان علل واسباب کو ذکر کیا گیا ہے اس سے امام خمینیؒ کے نزدیک ان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ البتہ امامؒ کے کلام میں جو مشکلات بیان ہوئی ہیں، مختلف مواقع اور متعدد مناسبتوں اور شاید وقت کی نزاکتوں کا بھی اس میں بڑا ہاتھ ہو، لہٰذا اس اہمیت کا اندازہ لگانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہم اپنی ناقص رائے کے مطابق اس اہمیت کا استنباط کریں گے۔

ا۔ تفرقہ واختلاف :

اتحاد بین المسلمین ایک اہم قرآنی اصول ہے جو قرآن کی محکم اور واضح آیات سے ثابت ہے۔ امام خمینیؒ کے متعدد ارشادات میں اس بات کی جھلک ملتی ہے کہ آپ اس عظیم قرآنی اصول پر مکمل ایمان رکھتے تھے اور اس لحاظ سے تفرقہ اور اختلاف کو شریعت اسلامی کے اہم مقاصد کی مخالفت قرار دیتے تھے۔(1)

ایک موقع پر آپ نے اس اہم ہدف کی تشریح کرتے ہوئے یوں فرمایا:

اسلام اس لیے آیا ہے تاکہ دنیا کی تمام اقوام چاہے عرب ہوں یا عجم، ترک ہوں یا فارس، سب کو آپس میں متحد کرے اور ایک عظیم امت، اُمت مسلمہ کے نام سے دنیا میں بروئے کار لائے۔۔۔، اسلام چاہتا ہے کہ دنیا ایک خاندان کی مانند ہو اور ایک ہی حکومت پوری دنیا پر، اور وہ بھی عادل حکومت حکمرانی کرے اور سب لوگ، اسی خاندان کے افراد شمار ہوں۔(2)

امام خمینیؒ اپنے دور میں اُمت مسلمہ کے تفرقے اور اختلاف کے مضر اثرات کو واضح طور پر اور وسیع پیمانے پر دیکھ رہے تھے، اور اسی کو اُمت مسلمہ کی زبوں حالی کی ایک اہم وجہ قرار دیتے تھے۔ اس تفرقے اور اختلاف کی حقیقت بیان کرتے ہوئے آپ نے اس اختلاف کو دو سطحوں پر ذکر کیا ہے، ایک عوام الناس کے درمیان جبکہ دوسری سیاسی سطح پر، یعنی حکمرانوں کے آپس میں اختلاف کو بھی اُمت اسلامی کی بد بختی اور مصائب کی ایک بڑی وجہ قرار دیا،(3)

آپ کی نگاہ میں اسرائیل ــ جس کی حمایت مغربی دنیا اور امریکہ کر رہا ہے۔ کو شکست نہ دے سکنے کی ایک اہم وجہ مسلمان حکمرانوں کا ایک پٹڑی پر نہ ہونا اور مختلف طریقوں سے ۔ جن میں ایک اہم بیرونی طاقتیں ہیں۔ ان کے درمیان اختلاف اور تفرقہ اندازی کا عنصر ہے۔(4)

آپ اس دور کے رائج سیاسی مسلمہ اصولوں کی مخالفت کی ایک وجہ یہی بیان کرتے ہیں کہ اس سے اسلامی اتحاد اور وحدت اُمت پر کاری ضرب لگتی ہے۔ منجملہ قومیت پرستی اور نیشنلزم ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

یہ جو بار بار کہتا ہوں کہ قوم پرستی مسلمانوں کی بد بختی کی جڑ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم پرستی ایرانی قوم کو دیگر مسلم اقوام کے مقابل میں لا کھڑا کرتی ہے، اور عراقی قوم کو دیگر مسلم قوموں کے اور اسی طرح باقی اقوام کی مثال لے لیں۔۔۔،(5)

آپ نیشنلزم اور قوم پرستی کو مکر و فریب سمجھتے تھے، جس کے ذریعے امت مسلمہ کی وحدت کو خطرات سے دوچار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔(6) آپ نے قوم پرستی کے نام پر تفرقہ ڈالنے والوں کو شیطانی لشکر قرار دیتے ہوئے،(7) کئی بار صراحت کے ساتھ قوم پرستی کو اسلام کا مخالف اور نکتہ مقابل قرار دیا ہے، جس میں تقابل اقوام کی بو آتی ہے۔(8)

ان سب تاکیدات کے باوجود، آپ نے شیعہ اور اہل سنت کے درمیان مذہبی اختلاف کو قوم پرستی سے بھی زیادہ خطرناک اور مہلک مرض قرار دیتے ہوئے فرمایا:

قوم پرستی سے زیادہ خطرناک اور غم برانگیز مسئلہ شیعہ اور اہل سنت کے درمیان تفرقہ اندازی اور اسلامی وایمانی برادری کے درمیان نفرت اور دشمنی ایجاد کرنا ہے۔(9)

ایک اور مقام پر فرقہ واریت کے مضر اثرات کو یوں بیان فرمایا:

ایمان اور اسلام کی رنگ و بو۔جو اقتدار اور کامیابی کی اصل بنیاد ہے۔فرقہ واریت اور تنازعات کے باعث جو نفسانی خواہشات سے ہم آہنگ جبکہ الٰہی دستور کے مخالف ہے، زوال پذیر ہو جاتی ہے۔(10)

اسی خطاب کے دوران آپ نے مسلمانوں کو اس تفرقہ اور اختلاف کے عملی اثرات کا احساس دلایا اور فرمایا:

اے مسلمانو: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم نے اسلام کے ابتدائی دور میں نہایت ہی معمولی تعداد کے ہوتے ہوئے بڑی بڑی طاقتوں کو شکست دے کر ایک عظیم اسلامی اُمت کی داغ بیل ڈالی، اب جبکہ تمہاری تعداد تقریباً ایک عرب کو پہنچ رہی ہے اور بڑے بڑے معدنی ذخائر ہونے کے باوجود۔جو کہ ایک بہت بڑا ہتھیار ہے۔اس طرح سے ضعیف اور ناتوان ہو چکے ہو؟ کیا جانتے ہو کہ تمہاری ساری مصیبتیں تمہارے حکمرانوں کے درمیان اختلاف کے نتیجے میں خود تمہارے درمیان اختلاف کا باعث بنی ہوئی ہیں۔(11)

مسلمانوں کے درمیان اتحاد کے فقدان پر آپ شدید رنج اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے، اسی عنصر کو مسلمانوں کے عدم استقلال کی اہم وجہ قرار دیتے ہیں۔(12) آپ کی نظر میں مسلمانوں کے وسائل اس لیے لوٹ مار کا شکار ہو رہے ہیں کہ ان میں اتفاق و اتحاد نہیں ہے، آج بڑی طاقتوں کے ہاتھوں ان کے استحصال کا سبب بھی ان کا باہمی تفرقہ ہی ہے۔آپ بھانپ چکے تھے کہ بڑی طاقتیں قوم پرستی کو ہتھیار بنا کر کسی کو ایرانی کے نام پر، تو کسی کو ترکی کے نام پر اور کوئی عرب و عجم کے اختلاف کی بنیاد پر،

غرض ہر ایک کو اس کی اپنی قوم تک محدود کرکے، وہ اپنے پلید مقاصد تک پہنچ رہی ہیں۔ فلسطین کے مسئلے کے حل نہ ہونے کی ایک اہم وجہ بھی اسی قسم کے تفرقہ ہے۔(13)

آپ شیعہ اور سنی کے بجائے پوری امت مسلمہ کو ایک آنکھ سے دیکھتے تھے اور آپ کی اس سوچ کا عملی مظاہرہ سلطنت عثمانیہ کے بعض مثبت نکات کو مد نظر رکھ کر اسلامی دنیا کے حوالے سے اس کے فوائد کی طرف توجہ کرنے میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

عثمانی سلطنت کے زمانے میں مسلمان کسی حد تک طاقتور حکومت سے بہرہ مند تھے اور ایک ایسا اقتدار تھا کہ کبھی جاپان تو کبھی روس کے ساتھ لڑائی کرکے ان پر کامیابی حاصل کر لیتے تھے، لیکن افسوس کہ اسی وجہ سے بیرونی طاقتوں نے -جو اسی وحدت سے ڈرتے تھے- جب پہلی عالمی جنگ میں کامیابی حاصل کی، تو عثمانی سلطنت کے ٹکڑے کر ڈالے اور ہر کسی کو ایک خاص علاقے پر حکمران بنا دیا اور یہ کوشش کی کہ یہ حکومتیں آپس میں دشمن بن جائیں، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مسلمان اگر اس قدر آبادی اور قیمتی ذخائر –جن سے وہ مالامال ہیں- کے ہوتے ہوئے اگر متحد ہو جائیں تو امریکا اور مغرب کو تو کوئی نہیں پوچھے گا۔(14)

آپ کے ان اقوال اور ارشادات کی روشنی میں یہ نتیجہ لینا کوئی مشکل نہیں ہے کہ امت مسلمہ کی ایک اہم مشکل آپ کی نظر میں اتحاد اور وحدت کا فقدان ہے، اور اس کی بڑی وجہ آپ کی نگاہ میں بیرونی طاقتیں اور مسلمان حکمرانوں کی نااہلی اور بے بصیرتی اور اس کے نتیجے میں پائی جانے والی سطحی سوچ ہے۔

۲۔ سیاسی بحران:

امام خمینیؒ کی نظر میں مسلمانوں کے انحطاط و زوال میں ان کے سیاسی نظام کا فقدان اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے بسی کا اہم کردار ہے۔ مسلم حکمران نااہل اور بے صلاحیت ہیں، جن میں بصیرت کے فقدان کے علاوہ استقلال اور استحکام کا دور دور تک کوئی سراغ نہیں ملتا۔ نہ ان حکمرانوں کو امت مسلمہ کی فکر ہے اور نہ ہی انہیں اپنی قوم اور ملک و ملت کی، فقط اپنی کرسی بچانے کی فکر میں ہیں جبکہ بڑے بڑے اہداف کا کوئی وجود نہیں ملتا۔ آپ فرماتے ہیں:

> "میری نظر میں اسلامی ممالک میں پائی جانے والی دو بڑی بنیادی مشکلیں ہیں: ایک مشکل حکومتوں اور قوم کے آپس کی ہے کہ حکومتیں اپنی اپنی اقوام سے جدا ہیں، نہ حکومت اپنے آپ کو قوم کا حصہ سمجھتی ہے، اور نہ ہی قومیں اپنے کو حکومت کا حصہ سمجھتی ہیں۔ اس مشکل کی چابی

حکومتوں کے ہاتھ میں، اگر حکومتیں اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ وہ اپنی قوم کی خادم ہیں تو قومیں بھی ان سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گی، دوسری مشکل بھی ایک بنیادی مشکل ہے وہ قوموں اور حکومتوں کے لیے، وہ خود حکومتوں کے اندر ہے۔ حالانکہ اسلام نے اتحاد کی دعوت دی ہے، قرآن کریم نے مسلمانوں اور اہل ایمان کو بھائی قرار دیتا ہے، اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ حکومتیں آپس میں اختلاف کا شکار ہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ دو حکومتیں -جو دونوں اسلامی ہیں- دونوں کی حقیقت ایک ہے، ان کا قرآن ایک ہے، پیغمبر ایک ہے، وہ اسلام کی اس دعوت پر لبیک کیوں نہیں کہتیں؟ وہ بھی ایک ایسی دعوت جو ان کے اپنے فائدے میں ہے، اگر یہ دعوت قبول کر لی جائے اور اسلامی حکومتیں آپس میں متحد ہو جائیں، اگرچہ ان کی سرحدیں اپنی جگہ محفوظ رہیں، فقط اتحاد ہی کر لیں، تو ایک ارب مسلمان ایک عظیم طاقت بن کر سامنے آئیں گے"۔

یہ کہ حکمرانوں کے اندر یہ عملی سستی کہاں سے اور کیسے وجود میں آئی؟ اس حوالے سے امام خمینیؒ نے ان حکمرانوں کے تفکراتی اور تعلیمی پس منظر کی طرف توجہ دیتے ہوئے یوں بیان فرمایا:

"ان میں سے بعض اسلامی حکومتیں ترجیح دیتی ہیں کہ کارٹر کے تسلط کو قبول کر لیں، لیکن اسلام کی طرف مائل نہ ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسلام کی معرفت نہیں رکھتے۔ یہ اپنی زندگی کے ابتدائی دور ہی سے اسلامی ماحول سے دور زندگی گزارتے رہے، جہاں اسلام کا نام و نشان نہ تھا، اور بعد میں بیرون ملک - یورپ یا امریکا- چلے گئے، جہاں تعلیم مکمل کی اور [نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ] اسلام اور اسلامی احکام سے بے خبر رہے، اسلامی حکومت کا نام تک نہیں سنا، جاننا تو دور کی بات ہے کہ اسلامی حکومت ہوتی کیا ہے؟" (15)

مسلمانوں کے اندر سیاسی عدم بصیرت اور پائے جانے والے سیاسی بحران کے نتیجے میں مغربی دنیا سے آنے والی آئیڈیالوجی کے خریدار زیادہ نظر آتے ہیں۔

۳۔ استعماری طاقتیں:

امام خمینیؒ امت مسلمہ کی زبوں حالی کی ایک اہم وجہ بیرونی طاقتوں کی بے جا مداخلت اور ان کی سازشوں کو قرار دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اسلامی دنیا اور اُمت مسلمہ کو شعور دیا کہ وہ اپنے فیصلے خود کریں

اور بیرونی فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم نہ کریں۔ آپ نے بیرونی تسلط کو سب سے بڑا منکر اور برائی قرار دیا، جس سے نہی کرنا اور روکنا علماء کا اہم فریضہ ہے۔ فرماتے ہیں:

"سب سے بڑی برائی، اغیار [بیرونی طاقتوں] کا ہم پر مسلط ہونا ہے، اس برائی کا راستہ روکنا چاہیے"۔(16)

آپ کی نظر میں استعماری ہتھکنڈے نہایت ہی پنہان اور چھپ چھپا کر عمل کر رہے تھے، جن کی طرف سطحی سوچ رکھنے والے حضرات متوجہ نہیں تھے، لہٰذا امت مسلمہ کے دانشوروں اور صاحبان خرد کو ان سازشوں کی نوعیت کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "سامراجی طاقتوں نے آپ کے لیے بہت گہرے خواب دیکھ رکھے ہیں، نہایت ہی گہرے خواب اسلام اور مسلمانوں کے لیے دیکھ رکھے ہیں، وہ اسلام کا اظہار کرکے آپ کے خلاف خطرناک سازشیں کر رہے ہیں، آپ لوگ صرف اور صرف تہذیب نفس، تنظیم اور درست تدبیر کے ذریعے ان مشکلات کو اپنے راستے سے ہٹا سکتے ہیں، اور ان کی استعماری سازشوں کو ناکام بنا سکتے ہیں۔۔۔ آپ کا مستقبل تاریک ہے اگر اپنے آپ کی اصلاح نہ کی اور تیار نہ ہوئے"۔(17)

آپ کے اس بیان میں مسئلے کی پیچیدگی اور سنگینی کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے، یعنی: مسئلہ فقط یہ نہیں ہے کہ بیرونی طاقتیں فقط اور فقط بیرونی نفوذ کے ذریعے اپنے سیاسی طرز تفکر کو ہم پر مسلط کر رہی ہیں، بلکہ بات ہمارے اندر تک پہنچ چکی ہے، اور اگر ہم اپنی اصلاح نہ کریں تو ہم بھی انہی کی طرح سوچنے پر مجبور ہو جائیں، اس لیے اصلاح نفس کے علاوہ عمیق مطالعات اور تنظیم و ترتیب کی ضرورت ہے۔ آخری جملہ نہایت ہی غور طلب ہے، جس میں امام خمینیؒ پورے یقین کے ساتھ تاریکیوں کی خبر دے رہے ہیں، گویا وہ آج کی داعش کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ دیکھ رہے تھے کہ اگر امت مسلمہ نے موجودہ استعماری سازشوں کو ناکام نہ بنایا تو کس قدر تاریک مستقبل ان کے انتظار میں ہے۔ واضح طور پر بیرونی طاقتوں سے بننے والے اس بدبخت اتحاد میں وہی پرانی کہانی دہرائی جا رہی ہے، ایک طرف نااہل اور بے بصیرت جاہ طلب حکمران، دوسری طرف، استعماری طاقتیں اور تیسرا عنصر، ہمارے اندر موجود کوتاہ فکر عناصر ہیں جو اب ہمارے نہیں رہے، بلکہ ان کے نوکر بن چکے ہیں، کیونکہ نہ ان کے پاس سیاسی بصیرت تھی اور نہ ہی دینی معرفت۔

اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک بار پھر آپ خطرے کا اعلان کرتے ہیں:

"جیسا ماحول بن چکا ہے، اللہ نہ کرے تاریک دن آپ کے منتظر ہوں اور آپ کو برے دن دیکھنے پڑیں، استعماری ہاتھ اسلام کی ساری حیثیتوں کو ختم کر دینا چاہتے ہیں اور آپ کو ان کے سامنے ڈٹ جانا چاہیے، اور یہ کام حب ذات، جاہ طلبی اور غرور و تکبر کے ہوتے ہوئے انجام نہیں پا سکتا"۔(18)

ان سب کے باوجود آپ اس بات سے بھی پوری طرح باخبر تھے کہ عوام الناس ان سب سازشوں سے بے خبر ہیں، چنانچہ اس بات کو ایک مقام پر یوں بیان فرمایا:

"اگر مسلمان جان لیتے کہ کیسی کیسی سازشیں اسلام کی عزت، مسلم اقوام کی سعادت اور اسلامی ممالک کے استقلال کے خلاف کی جارہی ہیں تو کبھی بھی عید (خوشی) نہ مناتے"۔(19)

۴۔اسلامی ثقافت اور قرآنی سیاست سے دوری:

امام خمینیؒ کی نظر میں مسلمانوں کے انحطاط کے اسباب میں سے ایک اور اہم سبب مسلمانوں کا اسلامی ثقافت اور تہذیب و تمدن سے ناآگاہ ہونا ہے۔ اسی جہل اور ناآگاہی کے سبب وہ اسلامی ثقافت کو نہیں سمجھتے اور اس پر بھروسہ نہیں کرتے اور مجبوراً مغربی طاقتوں کے سائے تلے اپنی سعادت ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس حوالے سے آپ فرماتے ہیں:

"اسلامی حکومتوں کی قرآن سے دوری نے اُمت مسلمہ کو اس شرمناک صورتحال سے دوچار کر رکھا ہے، جس کے نتیجے میں مسلم اقوام اور اسلامی ممالک کی تقدیر، دائیں بائیں استعمار کی سازشی سیاستوں کی آماجگاہ بن گئی ہے۔(20)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

مسلمانوں کی ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اُنہوں نے قرآن کو کنارے لگا دیا ہے اور دوسروں کے پرچم تلے جمع ہو گئے ہیں"۔(21)

یہاں سوال پیش آتا ہے کہ امت مسلمہ کے قرآن کو کنارے لگا دینے سے امام خمینیؒ کی مراد کیا ہے؟ قرآن کے وہ کونسے احکام ہیں جن پر مسلمان عمل پیرا نہیں ہو رہے؟ وہ کونسے احکام ہیں جن سے مسلمان دور ہیں؟ کیا مسلمان نماز، روزے، زکات، خمس اور صدقات و عطیات سے دور ہیں؟ یا پھر آپ کی ان احکام سے کچھ اور مراد ہے؟

اس حوالے سے امام خمینیؒ نے کئی بار وضاحت فرمائی ہے کہ آپ کی مراد قرآن کے سیاسی اور معاشرتی مسائل سے دوری ہے۔ اسلام ایک معاشرتی دین ہے، معاشرے سے دور رہ کر وہ اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتا، یا پھر ناقص حد تک باقی رہتا ہے۔ امام خمینیؒ نے چند ایک نمونوں پر نہایت ہی زور دیا ہے اور تاکید کے ساتھ ان احکام کے احیاء میں جد و جہد کی ہے:

ان میں سے ایک آیت: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعاً وَلا تَفَرَّقُوا (22)

اس آیت کے حوالے سے آپ کا ایمان تھا کہ اگر مسلمان فقط اور فقط اسی ایک آیت پر پوری طرح عمل پیرا ہو جائیں تو ان کی سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی مشکلات رفع ہو جائیں گی۔ (23)

ایک اور آیت جس پر امام خمینیؒ نے کئی بار صراحت کے ساتھ اپنا موقف بیان کیا ہے، وہ آیت ہے جسے نفی سبیل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے: وَلَنْ يَجْعَلَ اللهُ لِلْكافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (24)۔ اس آیت کی تفسیر میں امام خمینیؒ مختلف احتمالات اور مفروضوں کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خداوند متعال کی مراد یہاں مطلقاً ہر قسم کے سبیل و طریق اور تسلط کی نفی ہے، تکوینی لحاظ سے بھی اور تشریعی لحاظ سے بھی۔ تکوینی لحاظ سے خدائی مدد یہ ہے کہ اللہ تعالی نے پیغمبر اسلام ﷺ اور مومنین کی مادی اور معنوی لحاظ سے کئی ایک مقامات پر نصرت فرمائی ہے اور انہیں فتح کا یقین دلایا ہے، جبکہ اس قسم کی مادی اور معنوی مدد کافروں کے لیے ہر گز قرار نہیں دی گئی۔ تشریعی لحاظ سے یہ ہے کہ اللہ تعالی نے قانونی اور شرعی لحاظ سے بھی کسی قسم کے تسلط اور حکمرانی کا جواز کافروں کے لیے صادر نہیں فرمایا۔ (25)

آپ نے اس آیت کی بنیاد پر اُمت مسلمہ کو یہ پیغام دیا کہ اغیار کا تسلط اور برتری۔ چاہے وہ کسی بھی قسم کا ہو۔ مسلمانوں پر قبول کرنا قرآن کی نظر میں قابل قبول نہیں ہے اور ایک ناقابل بخشش گناہ ہے۔ آپ نے اسی آیت کی بنیاد پر اپنا ہدف تعیین کرتے ہوئے فرمایا: "ہمارا ہدف اغیار کے تسلط کا خاتمہ ہے"۔ (26)

اغیار کا تسلط اور نفوذ کئی ایک طرح کا ہو سکتا ہے، کبھی وہ سیاسی نفوذ رکھتے ہیں تو کبھی معاشرتی اور کبھی اقتصادی حوالے سے کسی معاشرے کو ہائی جیک کر لیتے ہیں۔ امام خمینیؒ نے ان سب سے بڑھ کر جس چیز کو خطرناک گردانا ہے، وہ کلچرل اور ثقافتی نفوذ ہے۔ آپ اس مسئلے کو ام الامراض یعنی سب مشکلات اور امراض کی جڑ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

جس چیز کو ام الامراض گردانا جا سکتا ہے، وہ دن بدن بیرونی استعماری ثقافت کا روبہ افزائش ہونا ہے، کہ جو ایک طویل عرصے سے ہمارے جوانوں کی اپنے زہر آلود افکار کے ساتھ تربیت کر رہی ہے اور مسلمان ممالک میں موجود سامراج کے نوکر اس کی حمایت کر رہے ہیں۔(27)

آپ کی نظر میں ثقافتی تسلط اور برتری سب سے زیادہ خطرناک عنصر شمار ہوتا ہے، ان تعبیروں سے جو آپ نے کلچرل تسلط کے حوالے سے استعمال کی ہیں، اس مسئلے کی سنگینی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ایک طرف آپ نے مسلم معاشرے کے اندر موجود جتنے بھی امراض اور مشکلات دیکھے ہیں، ان سب کی جڑ اسی ثقافتی نفوذ کو قرار دیا ہے۔ یعنی آپ کی نظر میں دیگر تمام مشکلات کا اصلی سرچشمہ اغیار کی تہذیب کا ہمارے اندر رسوخ ہے۔ دوسری تعبیر جو آپ نے استعمال کی وہ "زہر آلود افکار" ہے۔ آپ اس بات کو بھانپ چکے تھے کہ یہ افکار معاشرے میں اسلامی اقدار کو فروغ دینے اور رواج دینے کے لیے کسی زہر قاتل سے کم نہیں ہیں، کیونکہ جس معاشرے میں مغربی ثقافت اور اقدار رواج پا جائیں، اس میں اسلامی اقدار خود بخود مر جاتی ہیں، اس لیے یہ افکار کسی زہر قاتل سے کم نہیں ہیں۔

امام خمینیؒ اسی نکتے کو یوں بیان فرماتے ہیں:

"ایک فاسد استعماری تہذیب کا نتیجہ سوائے ایک استعمار زدہ نوکر کے اور کچھ نہیں"(28)

یعنی استعماری کلچر ایک ایسی بگڑی ہوئی ماں کی مانند ہے جس کی اولاد، اپنی سوچ اور تفکر میں ہمیشہ مغربی طاقتوں کے غلام کے طور پر پروان چڑھتی ہے، ایسے میں ان کا دائرہ فکر کبھی بھی ایک نوکر سے آگے نہیں بڑھتا، فکری استقلال کی یہ کمی ان کی سب سے بڑی مصیبت ہے جو اس ثقافتی تسلط کے نتیجے میں ان کے گلے کا طوق بنی ہے۔ ایک اور مقام پر امام خمینیؒ اسی عنصر کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان فرماتے ہیں:

کئی سالوں کے طویل مطالعے کے بعد ان کے ماہرین اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ ان کے مفادات کے سامنے کھڑی دیواروں کو گرانا ہوگا۔ ان گہرے مطالعات اور تحقیقات کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ایک بہت بڑی رکاوٹ اس ملک کی تہذیب ہے، چنانچہ اگر ایک آزاد یونیورسٹی جو کسی سے وابستہ نہ ہو ایران میں بن جائے اور وہاں لوگوں کی صحیح تربیت ہونے لگے اور مستقل افکار کے حامل لوگ سامنے آنے لگیں تو وہ ان غلط فائدہ اٹھانے والوں کا راستہ روک لیں گے، پس ان کی تہذیب کو پیچھے دھکیل دینا چاہیے تاکہ (زیادہ سے زیادہ) فائدہ اٹھایا جا سکے۔(29)

ثقافتی حوالے سے آپ کے فرامین کا پوری طرح جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آپ تہذیبی یلغار کے اثرات کو کس قدر عمیق اور موثر جانتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے استعماری ثقافت کو سب امراض کی جڑ قرار دیا ہے، کیونکہ یہی وہ کلچر ہے جو سامراج کے سیاسی تسلط کا باعث بنتا ہے، یہی کلچر ہے جس کے ذریعے انہوں نے ہمارے اقتصاد کو اپنے ہاتھ میں لیا ہوا ہے۔ آج اگر ہمارے اندر فضول خرچیوں اور لذت پرستی کے بجائے، قناعت اور زہد حاکم ہوتا تو کبھی اس حد تک مغربی برتری کو اتنے پر تپاک انداز میں گلے نہ لگاتے۔ اگر ہم آج بھی استعماری تہذیب کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکیں تو یقیناً آنے والی نسلیں آزادی کا مزہ چکھ سکیں گی اور اسلامی ثقافت میں سانس لینا ان کے لیے ممکن ہو پائے گا۔

اسلامی ثقافت سے دوری کے باعث امت مسلمہ پر یہ افتاد آن پڑی کہ مغربی ثقافت کو خوشی خوشی گلے لگالیا اور اپنی پہچان اور خودی کا سودا کر لیا، اس کے بدلے میں بے حیائی اور برائی لے لی۔ یہی وجہ ہے کہ امام خمینیؒ نے قرآنی اور اسلامی ثقافت کے رواج دینے کو امت مسلمہ کی اہم ضرورت قرار دیا ہے اس اہم مقصد کے حصول کے لئے اپنی پوری قوت صرف کر ڈالی تھی۔ ذیل میں اس جدو جہد کے چند نمونے پیش کرتے ہیں:

ایک موقعہ پر فرمایا:

"سرزمین مشرق کے پاس اسلامی ثقافت ہے جو سب ثقافتوں سے بلند مرتبہ اور ترقی یافتہ ہے۔ اس لیے اہل مشرق کو چاہیے کہ اسلامی ثقافت کے ذریعے اپنی ساری ضرورتوں کی اصلاح کریں اور مغرب کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں، مغرب سے فقط ایک ہی مطالبہ کریں اور وہ یہ کہ وہ اپنی اصلاح کرے"۔(30)

آپ نے نظریاتی استقلال کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا:

اگر ہم استقلال کی تلاش میں ہیں، آزادی چاہتے ہیں، اپنے ملک کو خود چلانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے آپ کو تلاش کرنا ہوگا، ہم نے اپنے آپ کو کھو دیا ہے، ہمیں اپنے آپ کو تلاش کرنا چاہیے، مغربی تاثیر سے اپنے آپ کو باہر نکالنا چاہیے، یہ نہ سمجھیں کہ سب کچھ وہاں ہے اور ہمارے پاس کچھ بھی نہیں، ہر گز ایسا نہیں ہے، ہمارے پاس سب کچھ ہے، ہماری تہذیب نہایت ہی غنی اور مالا مال ہے، فقط اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔(31)

ایک مقام پر الجزائر کے مسلمانوں کی طرف ایک پیغام میں فرمایا:

"ان مشکلات کے حل کا بنیادی قدم یہ ہے کہ مسلم اقوام اور حکومتیں -اگر وہ قومی ہیں تو- کوشش کریں کہ مغرب سے اپنی فکری وابستگی ختم کریں اور اپنی ثقافت اور اصلیت کا ادراک کریں اور اسلام کی ترقی یافتہ ثقافت ــجس کی بنیاد وحی الٰہی ہے- کو پہچانیں اور پہچنوائیں"۔(32)

۵۔ علماء کا کردار:

پیامبر اسلام ﷺ کی ایک حدیث کے مطابق معاشرے کے دو طبقے ایسے ہیں جن کا گناہ اور برائی خود ان کے اپنے تک محدود نہیں رہتی بلکہ پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے، ایک علماء اور دوسرا مالدار اور امیر طبقہ۔(33) حضرت علیؑ سے منسوب ایک حدیث میں ہے کہ عالم کی غلطی کشتی کے ٹوٹنے کی مانند ہے جو خود تو ڈوبتی ہی ہے، دوسروں کو بھی لے ڈوبتی ہے۔(34)

امام خمینیؒ جہاں مغربی سازشوں اور ہتھکنڈوں کو اسلامی دنیا کی خرابی کی اصل وجہ قرار دیتے تھے، جہاں وہ مسلمانوں کے اندر پائے جانے والے اختلاف اور تفرقے کو ان کی بدبختی اور بے چارگی اور سیاسی عدم استحکام کا سبب گردانتے تھے اور جہاں وہ امت مسلمہ کی اسلامی ثقافت سے دوری اور اس کے نتیجے میں اس پر ہونے والی مغربی ثقافتی یلغار کو مسلمانوں کی تہی دستی کا سبب قرار دیتے تھے، وہاں وہ غیر ذمہ دار اور فاسد علماء کے کردار سے بھی غافل نہ تھے۔اُمت مسلمہ میں اس طبقے کے کردار کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اگر طے پا جائے کہ ایک عالم (دین) فسادی ہو اور کسی دینی مدرسے کو خطرے میں ڈال دے تو اس کا فساد فقط ایک دینی مدرسے تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ پوری اُمت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ البتہ اس کے گناہ کی بدبو ہم اس (مادی) دنیا میں محسوس نہیں کر سکتے۔ لیکن آخرت میں -خدانہ کرے اگر جہنم گئے- تب احساس ہوگا کہ اس (بدعمل عالم دین) کے گناہ کی بدبو کس قدر زیادہ ہے اور اس کے دنیوی اعمال کے باعث لوگ وہاں کس قدر تکلیف میں ہیں۔ایک روایت میں ہے کہ اس قسم کے لوگ [اشد الناس حسرۃ(35)] یعنی سب سے زیادہ حسرت بھرے ہونگے"۔(36)

ایک مقام پر آپ نے عالم دین کے اندر موجود فساد اور برائی کو وبائی مرض سے تعبیر کیا ہے(37) جو خواہ ناخوہ پھیلتی جاتی ہے اور ایک سے دوسرے کو لگ جاتی ہے۔ کیونکہ آپ دیکھ رہے تھے کہ کس طرح کچھ علماء اپنے مفاد کی خاطر حق بات کرنے سے کتراتے ہیں اور اہل باطل کو ان کے باطل سے نہیں روکتے۔اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرتے ہیں۔امت مسلمہ کی کوئی فکر نہیں کہ ان پر کیا گذر رہی ہے۔ایک اور مقام پر فرمایا:

"کیونکہ ہم نے تہذیب نفس نہیں کی اس لیے [امت مسلمہ کی] فکر نہیں ہے، اگر تہذیب نفس کی ہوتی تو ضرور سوچ بچار کر رہے ہوتے"۔(38)

یہاں امام خمینیؒ اپنی صنف سے مخاطب تھے، اس لیے متکلم کے صیغے میں بات کی کہ ہم اگر اخلاق اور تہذیب نفس کا درجہ طے کر چکے ہوتے تو ضرور بالضرور ہمیں اُمت مسلمہ کی فکر ہوتی۔ اس کلام میں دنیوی آلودگیوں کے کردار کی طرف بھی نشاندہی پائی جاتی ہے، یعنی: ہمارا سکوت اور خاموشی، ہماری کوتاہ فکری اور سطحی سوچ کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو نہیں سنوارا اور اس لائق نہیں بنے کہ امت مسلمہ کی مشکلات اور مصائب کا ادراک کر سکیں اور ان کی فکر میں رہیں۔

اصولی طور پر امام خمینیؒ کی نظر میں علم خود بخود کسی کو سعادت مند یا شقی و بدبخت نہیں بنا سکتا، یعنی اس میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ کسی انسان کے راستے، ہدف اور منزل کا تعین کرے، بلکہ علم ایک وسیلہ ہے جس سے ہر انسان اپنی ظرفیت اور شخصیت کے مطابق فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس لیے امام خمینیؒ کی نظر میں علم حاصل کرنے سے پہلے تزکیہ نفس شرط ہے، ورنہ ظرف اگر نجس ہو تو مظروف بھی نجس ہو جائے گا۔

اس حوالے سے آپ فرماتے ہیں:

"اگر انسان خباثت کو اپنے باطن سے نکال باہر نہ کرے، تو جتنا درس پڑھتا اور علم حاصل کرتا جائے گا، نہ فقط اسے اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ بہت سے نقصانات کا باعث بنے گا، علم جب ایک خبیث [پلید] ظرف میں داخل ہو تو اس پر خبیث پتے اور شاخیں اگیں گی اور ایک شجرہ خبیثہ پیدا ہو جائے گا۔ یہ علمی مفاہیم جتنے سیاہ اور غیر مہذب دل کے اندر جمع ہوتے جائیں گے حجاب اور پردے زیادہ ہوتے جائیں گے۔ اس نفس میں جو مہذب نہیں ہوا علم ایک ظلمانی [تاریک] حجاب ہے، العلم ہو الحجاب الاکبر، علم ہی سب سے بڑا حجاب ہے"۔(39)

تزکیہ نفس اور صفائے باطن کے لیے ایک مقام پر نہایت ہی حسین مثال پیش کرتے ہیں:

تم اگر سرچشمے کو صاف کروگے تو وہاں سے صاف پانی باہر آئے گا، گدلی اور گندی جگہ سے نکلنے والے پانی سے شفافیت کی توقع مت رکھو۔(40)

امام خمینیؒ اپنی اس فلسفی تجزیے کو عملی میدان میں بھی پوری طرح مشاہدہ کر رہے تھے، اس لیے برملا ایسے لوگوں کے خلاف آواز بلند کی اور ان کی غلطیوں پر ان کی نشاندہی کی اور انہیں اصلاح کی دعوت دی۔

علماء کے کردار کی اہمیت کے مد نظر امام رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ہمیشہ مجاہدت اور جہاد کی دعوت دی اور ان کو عملی تہذیب اخلاق کے علاوہ فکری جمود سے نکلنے کی بھی دعوت دی اور یوں ان کے تفکرات کی اصلاح میں بھی کوشاں رہے، یعنی ضروری نہیں کہ منفی کردار ادا کرنے والے علماء، دنیا پرستی اور خواہشات نفسانی کی مرض میں مبتلا ہوں، کچھ اپنی کوتاہ فکری اور سطحی سوچ کے باعث مار کھا جاتے ہیں، اس لیے سب کے ساتھ ایک قسم کا سلوک روا رکھنے کے بجائے امام خمینیؒ نے ہر ایک گروہ کو اس کے اپنے مسائل اور مشکلات سے باخبر کیا اور حالات کے مطابق انہیں ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی۔ فرمایا:

اے اسلام کے سربراہو، اسلام کی مدد کو آؤ، اے نجفی علماء اسلام کی مدد کو آو، اے قم کے علماء اسلام کی مدد کو پہنچو، اسلام ہاتھ سے نکل رہا ہے۔(41)

ایک اور مقام پر علماء کے سامنے خطرے کا اعلان یوں فرمایا:

اے ایرانی علماء، اے اسلامی مراجع، میں خطرے کا اعلان کرتا ہوں، اے فضلاء، اے طلاب، اے مراجع، اے نجف، اے قم، اے مشہد، اے تہران، اے شیراز، میں خطرے کا اعلان کرتا ہوں۔

اس پیغام میں - جو واضح طور پر بیداری کا پیغام ہے- آپ نے ہر شہر کے علماء اور دانشوروں کو خطاب کرتے ہوئے ان کے سامنے حالات کی سنگینی کو پیش کیا، انہیں غفلت اور نیند سے باہر آنے کی دعوت دی۔ کیونکہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ امت کے صالح ہونے کے لیے علماء کا صالح ہونا ضروری ہے، اور صلاح اور درستکاری فقط عمل میں نہیں ہوتی، اس کے لیے نظریاتی غلطیوں کی اصلاح بھی ضروری ہوتی ہے۔

نتیجہ

امام خمینیؒ کی نظر میں امت مسلمہ اپنا فکری استقلال کھو چکی ہے، اسے اپنے آپ [خودی] کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے، ایک طرف اسے ثقافتی مشکلات کا سامنا ہے، اسلامی ثقافت سے ناآگاہی کے نتیجے میں ہونے والی دوری کے باعث مغربی ثقافتی یلغار نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے، دوسری طرف سے مسلم حکمران غفلت اور بے راہروی کا شکار ہیں اور ان کی ان مسائل پر کسی قسم کی کوئی توجہ نہیں ہے۔ وہ اپنی کرسی بچانے کی فکر میں اپنی اقوام اور ملل پر بھروسہ کرنے کے بجائے، مغربی طاقتوں کو وسیلہ بناتے ہیں۔ علماء کی ایک کثیر تعداد اپنے اصلی فریضے کو انجام دینے سے غافل ہے، کچھ تو مفاد پرست ہیں، جو فرقہ پرستی اور امت کے درمیان اختلاف و انتشار کے ذریعے اپنے مفادات تک پہنچ رہے ہیں، جبکہ کچھ اپنی کوتاہ

فکری کے باعث امت کے لیے وبال جان بنے ہوئے ہیں۔ اوپر سے بیرونی طاقتیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سرگرم ہیں، جو کسی بھی صورت مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے نہیں دیتیں اور امت مسلمہ ان سب چیزوں سے بے خبر خواب غفلت کے مزے لوٹ رہی ہے۔

ان مسائل کا لازمی اور حتمی نتیجہ ہر سطح پر پیدا ہونے والا اختلاف اور انتشار ہے۔ مسجد سے لے کر منبر تک، دینی پلیٹ فارموں سے لے کر دنیوی مراکز کی سطح تک۔ کہیں بھی مذہبی ہم آہنگی اور رواداری کا نام و نشان تک نہیں ملتا، اس دراڑ کے بڑھ جانے سے تکفیریت اور وہابیت کو شہ مل رہی ہے اور اسلامی بھائی چارہ ناپید ہو چکا ہے۔ سیاسی سطح پر مسلم ممالک، ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ روابط استوار کرنے کے بجائے، مغربی آقاؤں کو خوش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس صورتحال سے باہر نکلنے کے لیے ممکنہ راہ حل یہ تجویز کیے جا سکتے ہیں: اسلامی ثقافت -جس کا آئینہ قرآنی سیاسی اصول ہیں – سے آگاہی اور اس کی ترویج، علماء اور فقہاء کا زمانے کے تقاضوں کے مطابق معاشرتی سطح پر سرگرم عمل رہنا، اور استعماری طاقتوں سے امت کو نجات دلانا، حکمرانوں کا بیرونی طاقتوں کے بجائے خود اپنی قوم پر بھروسہ کرنا اور ان سب کے نتیجے میں پوری امت مسلمہ میں مذہبی، فکری، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حوالوں سے رواداری کا فروغ پانا ہے، تاکہ امت مسلمہ، امت واحدہ بن کر اسلامی تعلیمات پر انفرادی اور اجتماعی سطح پر عمل پیرا ہو سکے۔

*****

حوالہ جات

1 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، ، چہل حدیث، موسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، دسویں طبع، تہران، ۱۳۷۶ شمسی، ص ۳۱۰۔

2 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۱۳، ص ۴۴۳۔ مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، تہران، طبع چہاردہم، ۱۳۸۸ شمسی۔

3 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۷، ص ۱۸۵۔

4 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۳، ص ۲۵۶۔
5 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۱۳، ص ۸۷۔
6 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۶، ص ۲۲۔
7 ۔امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۱۳، ص ۴۴۴۔
8 ۔ دیکھیے: امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۱۲، ص ۳۳۴/ایضاج ۱۳، ۸۷
9۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۱۳، ص ۲۰۹۔
10 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۱۰، ص ۳۳۹۔
11 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۱۰، ص ۳۳۹۔
12 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۳، ص ۲۵۶۔
13 ۔ دیکھیے: امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۱۳، ص ۴۴۳-۴۴۴/ج ۷، ص ۱۸۶۔
14۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۷، ص ۱۸۶۔
15 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۱۱، ص ۲۹۵۔
16 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۷، ص ۱۸۷۔
17 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، جہاد اکبر، ص ۶۰-۶۱۔ مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی (رح)، تہران، اٹھارہویں طبع، ۱۳۸۷ ہجری شمسی۔
18 ۔امام خمینی، روح اللہ الموسوی، جہاد اکبر، ص ۶۱۔
19 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۱، ص ۱۵۷-۱۵۸۔
20 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۲، ص ۴۳۸-۴۳۹۔
21 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۱۳، ص ۲۷۵۔
22 ۔آل عمران، آیت ۱۰۳
23 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۱۳، ص ۲۷۵/ج ۸، صص ۳۰۷۔
24 ۔سورہ نساء، آیت: 141
25 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، کتاب البیع، ج ۲، ص ۷۲۰-۷۲۳، تلخیص اور تصرف کے ساتھ۔
26 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۴، ص ۹۱۔
27 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج ۲، ص ۳۴۶۔

28 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج۲، ص۳۴۶۔
29 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج۴، ص۱۹۶۔
30 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج۱۰، ص۳۸۵۔
31 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج۱۰، ص۳۸۶۔
32 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج۱۰، ص۳۹۵۔
33 ۔ شیخ صدوق، الخصال، ج۱، ص۳۱۷/ابن شعبہ حرانی، تحف العقول، ص۵۰
34 ۔ کراجکی، کنز الفوائد، ج۱، ص۳۱۹/لیثی علی بن محمد، عیون الحکم والمواعظ، ص۲۷۶۔
35 ۔ یہ اس روایت کی طرف اشارہ ہے جس میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: اشدُّ الناسِ حسرۃً یومَ القیامۃِ مَن وَصَفَ عَدْلاً ثم عَمِلَ بِغیرہ»؛ لوگوں میں سب سے سخت قسم کی حسرت میں مبتلا وہ شخص ہوگا جو عدالت اور نیکی کی توصیف و تعریف بیان کرے اور پھر خود اس پر عمل پیرا نہ ہو۔ اصول کافی، ج 2، ص 299.
36 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج۲، ص۱۷۔
37۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج۷، ص۲۵۶۔
38 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج۲، ص۳۶۸۔
39 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، ، جہاد اکبر، ص۱۸۔
40 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، ، آداب الصلاۃ، ص۱۷۲۔
41 ۔ امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، ج۱، ص۴۲۰۔

فہرست منابع

قرآن
1. ابن شعبہ حرانی، حسن بن علی، تاریخ وفات (چوتھی صدی ہجری)، محقق / مصحح: غفاری، علی اکبر، جامعہ مدرسین، قم، طبع دوم، 1404 / 1363ق۔
2. امام خمینی، روح اللہ الموسوی، چہل حدیث، موسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، طبع دہم، تہران، ۱۳۷۶ شمسی۔
3. امام خمینی، روح اللہ الموسوی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، تہران، طبع چہاردہم، ۱۳۸۸ شمسی۔
4. امام خمینی، جہاد اکبر، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی (رح)، تہران، اٹھارہویں طبع، ۱۳۸۷ ہجری شمسی۔

5. امام خمینی، آداب الصلاۃ، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی (رح)، تہران، سولہویں طبع، ۱۳۸۸ہجری شمسی۔
6. امام خمینی، روح اللہ الموسوی، کتاب البیع، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینیؒ، تہران، سوم، 1430 قمری۔
7. شیخ صدوق ابن بابویہ، محمد بن علی، (381 ق)، الخصال، محقق / مصحح: غفاری، علی اکبر، طباعت: جامعہ مدرسین، قم، طبع اول، 1362 شمسی۔
8. کراجکی، محمد بن علی (449 ق)، کنز الفوائد، محقق / مصحح: نعمت، عبداللہ، دار الذخائر، قم، طبع اول، 1410 قمری۔
9. کلینی، محمد بن یعقوب بن اسحاق (329 ق)، اصول کافی، محقق / مصحح: غفاری علی اکبر و آخوندی، محمد، دار الکتب الاسلامیہ، طبع چہارم، تہران، 1407 ق۔
10. لیثی واسطی، علی بن محمد (تاریخ وفات چھٹی صدی)، عیون الحکم و المواعظ، محقق / مصحح: حسنی بیرجندی، حسین، ناشر: دار الحدیث، قم، طبع اول، 1376 شمسی۔

اسلام اور غیر مسلموں سے تعلقات

(ایک تحقیقی جائزہ)

ڈاکٹر محمد افضل*

dr.muhammadafzalkarimi@gmail.com

کلیدی کلمات: اسلام، ابراہیمی، ادیان، یہودی، تعلقات، مفاہمت، جنگ، خونریزی، اہل کتاب۔

خلاصہ

انسان اپنی ماہیت میں اپنے ہمنوعوں کے ساتھ روابط استوار کرنے کا محتاج ہے۔ لہٰذا انسانی روابط کی ضرورت کو تمام ابراہیمی ادیان نے تسلیم کیا ہے۔ بد قسمتی سے بعض لوگوں کا تصوّر یہ ہے کہ اسلام دیگر اہل ادیان کے ساتھ ہر قسم کے رابطے سے روکتا ہے۔ عام مسلمان کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ ہر قسم کا رابطہ، تعلق، اسلام میں ممنوع ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اسلام پوری انسانیت کا دین ہے اور ہر انسان سے مسلمانوں کے رابطے کا خواہاں ہے۔

اس رابطے کا بنیادی قانون یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات ایسے نہ ہوں کہ مسلمانوں پر غیر مسلموں کو برتری حاصل ہو جائے۔

اس قانون کا لحاظ رکھتے ہوئے ہمیشہ مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات مطلوب رہے ہیں۔ رسول خدا ﷺ کے یہود و نصاریٰ سے لین دین رہا، اہلبیتؑ اور صحابہؓ بھی دوسرے ادیان کے پیروکاروں سے لین دین کرتے تھے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان تجارتی روابط بھی تھے۔ جنگی معاہدے بھی تھے۔ ایک دوسرے کے حلیف بھی تھے۔ میثاق مدینہ اس کی اہم ترین دلیل ہے۔ اس مقالہ میں اسلام کے غیر مسلموں، بالخصوص یہودیوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کو واضح کیا گیا ہے۔

*۔ شعبہ علومِ اسلامی، جامعہ کراچی۔

انسان اور تعلقات

انسان مدنی الطبع ہونے کے ناطے ہمیشہ دوسروں سے تعلقات استوار کرنے کا محتاج رہا ہے تاکہ اس کے تمام ذاتی اور اجتماعی مفادات آسانی کے ساتھ پورے ہو جائیں۔ مسلمانوں سمیت آسمانی ادیان کے پیروکاروں میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ صرف خدا کی ذات ہی کسی کی محتاج نہیں ہے۔ جتنی بھی مخلوقات اس دنیا میں موجود ہیں وہ زندگی میں مکمل خود کفیل نہیں ہیں۔ زندگی کے کسی نہ کسی گوشے میں تشنگی رہ جاتی ہے۔ اسی انحصار اور محتاجی کی وجہ سے اقوام ایک دوسرے کے قریب آجاتی ہیں۔ معاشی، مالی اور تکنیکی ضروریات کے علاوہ اور بھی ضروریات ہوتی ہیں جیسا کہ ہر انسان اپنی علاقائی سالمیت اور آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے اور اپنی آزادی کا دفاع اور حفاظت کرنے کی خاطر کسی نہ کسی شعبے میں دوسروں کا محتاج رہتا ہے۔

دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا فرد ہو جس کا کوئی دشمن نہ ہو۔ حکومتوں کی طرح افراد کے درمیان بھی کشیدگی اور دشمنی موجود رہتی ہے، جس کے سبب ان کے باہمی تعلقات نشیب و فراز کا شکار رہتے ہیں۔ ایسے حالات میں افراد کو بہتر تعلقات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور جہاں تک انسان کی وسعت میں ہو تعلقات کو درست سمت کی جانب گامزن کیا جاسکتا ہے۔ جھگڑوں کو بہتر انداز میں حل کیا جاسکتا ہے۔ انہی ضروریات اور مسائل کی بنا پر تعلقات کی اہمیت سے آج ہر انسان آگاہ ہے۔

اگرچہ قدیم زمانے سے ہی انسانوں کے درمیان بہتر تعلقات اور مسالمت آمیز زندگی کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے، مگر اس بات کی طرف بیسویں صدی کے بعد خصوصی توجہ دی گئی جب دنیا نے دو عظیم جنگوں کا ذائقہ چکھ لیا جس میں لاکھوں انسان لاحاصل اور بے مقصد خونریزی کی نذر ہوگئے۔ اب جبکہ دنیا ایٹمی ہتھیاروں سمیت دوسرے وسیع تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی آماجگاہ بن چکی ہے تو ابراہیمی ادیان سمیت دنیا کی مختلف اقوام کے درمیان تعلقات کے بارے میں از سر نو جائزہ لیتے ہوئے تعلقات کی اہمیت اور ضرورت سے دنیا کو روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔ ان تعلقات کی اہمیت اور ضرورت کو مندرجہ ذیل نکات کے ذریعے بیان کیا جاسکتا:

1۔ جنگ اور خونریزی سے نجات: جنگ اور خونریزی دنیا کو تباہی اور بربادی کی طرف لے جاتی ہے جس کی وجہ سے انسان کی مادی اور معنوی استعداد اور صلاحیتیں ماند پڑ جاتی ہے۔ اس تباہی اور بربادی سے انسان کو نجات دینے کے لیے خصوصا مذہب کے نام پر لڑی جانے والی جنگوں سے انسانوں کو نجات دینے

کے لیے آج کا انسان چاہے مسلمان ہو، یہودی ہو یا نصرانی، بہتر تعلقات اور مسالمت آمیز زندگی گزارنے کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے۔

2۔ دنیاوی واخروی سعادت: انسان کو خلقت سے نوازنے کا ایک فلسفہ یہ ہے کہ وہ خدائی نعمتوں سے اس دنیا میں استفادہ کرتے ہوے اس کی اطاعت کی راہ پر گامزن رہے تاکہ دنیا اور آخرت میں سعادت مند ہو پائے۔ جیسا کہ قرآن میں ذکر ہو رہا ہے:" مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔" (1) یعنی:" جو شخص نیک اعمال بجا لائے گا، مرد ہو یا عورت، درحالانکہ وہ مومن بھی ہوگا تو ہم اس کو (دنیا میں) پاک (اور آرام کی) زندگی سے زندہ رکھیں گے اور (آخرت میں) اُن کے اعمال کا نہایت اچھا صلہ دیں گے۔"

انسان اور اس کائنات کی خلقت کا ہدف یہ ہے کہ انسان مادی امکانات اور وسائل کو خدا کی راہ میں کام میں لائے تاکہ اس دنیا کے ساتھ دوسری دنیا کو بھی بہتر بنا سکے۔ یہ کام انسانوں کے درمیان مسالمت آمیز زندگی اور بہتر تعلقات کی موجودگی سے ہی ممکن ہے۔ اگر مسلمان اور یہودیوں سمیت مختلف ادیان کے ماننے والوں کے درمیان جنگ، خونریزی اور تعصّبات کا دور دورہ ہو تو نہ صرف انسان کی دنیاوی زندگی اجیرن ہو جائیگی بلکہ اس کی اخروی زندگی بھی داو پر لگ جائیگی۔

3۔ سعادت کے حصول میں تعاون: حق کی جانب حرکت کو خدا نے انسان کی فطرت میں رکھا ہے۔ اگر یہ کام کسی کی رہنمائی اور مدد کے ذریعے ہو تو انسان بہت کم مدت میں اس راہ کو پا لیتا ہے۔ انسان تنہا مسافر بن کر سعادت کی راہ کو پالے تو یہ کوئی کمال کی بات نہیں اور نہ ہی انسان کی پاک فطرت سے یہ کام موافق ہے۔ اسلام ہدایت یافتہ افراد کو کئی موارد میں حکم دیتا ہے کہ جس طرح خود حق پرستی کی راہ پہ گامزن ہوئے ہو اسی طرح دوسروں کو بھی حق کی راہ دکھانے کی کوشش کرو۔ اس کی اہمیت اس بات سے بھی عیاں ہوتی ہے کہ قرآن میں مختلف جگہوں پر فاصدع، بلغ، رسالت، دعوت جیسے الفاظ اور مشتقات موجود ہیں۔

یہ ہدف بھی مختلف ادیان کے پیروکاروں کے درمیان بہتر تعلقات کی روشنی میں ہی ممکن ہے چونکہ اگر مسلمانوں اور یہودیوں سمیت دوسرے ادیان کے پیروکاروں کے درمیان دشمنی اور تعصب ہو تو انسان

اچھائی کے انتخاب کی طاقت کھو دیتا ہے چونکہ تعصب کے ساتھ انسان طرفِ مقابل کو دشمنی اور تعصب کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ بنابرایں، اس ہدف کے حصول کے لیے بھی تعلقات قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

تعلقات کی اس ضرورت اور اہمیت کو اسلام کی نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے قرآن میں جگہ جگہ "یَا ایُّھاالنَّاسُ" کے خطاب سے آج سے پندرہ صدیاں پہلے ہی اس کی بنیاد ڈالی تھی۔ ابراہیمی ادیان میں سے سب سے زیادہ جس دین نے تعلقات اور رواداری کی ضرورت کو عملی اور نظریاتی طور پر اجاگر کیا ہے وہ دین مبین اسلام ہے۔ جس نے ابتدا سے ہی تعلقات کے مختلف ابعاد سے لوگوں کو روشناس کرایا۔ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کے بعد اسلام کی نگاہ میں تعلقات کے خدوخال واضح ہوتے گئے یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ اپنے اور پرائے میں فرق ایک فطری امر ہے مگر اس فرق کا مطلب ظلم، دھوکہ دہی اور مکر وفریب ہر گز نہیں۔ قرآن میں "یَا ایُّھاالنَّاسُ" اور "یَا ایُّھا الَّذِینَ" کے خطاب میں اس کی مثال نمایاں ملتی ہے۔ گویا اقوام میں تقسیم رنگ ونسل اور رسم اور رواج کی بنیاد پر نہیں، اللہ تعالی کی جانب سے بھیجی جانے والی ہدایت کو قبول کرنے اور نہ کرنے کی بنیاد پر ہے۔

اسی اصول کو اسلام نے امت کی بنیاد قرار دیا ہے۔ لیکن چونکہ اسلام کے مقابلے میں متعدد افکار اور نظریات پر مشتمل نظام دنیا میں رائج تھے اسی لیے کمالِ حکمت کے ساتھ ان اقوام کے ساتھ تعلقات کے اصول اور روابط طے کر لیے گئے۔ ان اصول اور ضوابط کی بنیاد یہ ہے کی پوری دنیا کے انسانوں میں تعلقات کی اصل بنیاد، حالت امن ہے مگر اختلاف، کشمکش اور جنگ کی صورت میں تعلقات میں کشیدگی کو کم سے کم کرنے اور حالت امن کی بحالی کے لیے ضروری اصول اور ضوابط بھی متعارف کرائے جائیں۔ چنانچہ ہجرت مدینہ کے فورا بعد حالت امن کو مد نظر رکھ کر پہلی مملکت کا جو پہلا دستور دیا اس میں دو چیزیں نمایاں ہیں۔ ان میں سے ایک کو مواخات مدینہ اور دوسری کو میثاق مدینہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مواخات میں مسلمانوں کے آپس میں بحیثیت قوم کے تعلقات کا نظام وضع کیا گیا اور میثاق مدینہ میں مدینہ کے ارد گرد کے یہودیوں سے تعلقات کے اصول مرتب کیے گئے، جس میں ان تمام اقوام کو مذہبی اور معاشی خود مختاری دی گئی، مگر دفاع اور ریاست کے تحفظ کے معاملات کو وفاقی نظام کے تحت مربوط کیا گیا۔ (2) بہر حال اسلام کی نگاہ میں تعلقات ذاتی طور پر ایک احسن عمل ہے اور عقلی طور پر بھی

اس کی اہمیت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کیونکہ کوئی ایسا زمانہ یا کوئی ایسا فرد نہیں گزرا جس نے قلبی اور فطری طور پر اس کی اہمیت سے انکار کیا ہو۔

ہاں یہ الگ بات ہے کہ مختلف نسلی، قومی، قبائلی، سیاسی اور اقتصادی عصبیتوں کی وجہ سے بنی نوع بشر کو ہمیشہ افتراق اور تنازعات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان سب وجوہات کے باوجود تعلقات کی عقلی اور فطری اچھائی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ اسلام کا ظہور جس وقت ہوا وہ زمانہ امن عامہ اور باہمی رواداری کے لحاظ سے بدرجہ اتم انحطاط کا شکار تھا۔ معمولی باتوں پہ سالہا سال باہمی تنازعات کا شکار رہتے تھے۔ بغیر کسی مبالغہ آرائی کے یہ مسئلہ اس دور کی معاشرتی برائیوں میں سرفہرست تھا جس کی وجہ سے ایک طرف معاشرہ ہرج ومرج کا شکار تھا تو دوسری طرف بے مقصد جنگوں کی وجہ سے بہت سے خاندان بے سرپرست ہو گئے جس سے ان کی خاندانی اکائیاں متاثر ہوئی تھیں۔

ایسے موقع پر اسلام نے اس برائی کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کا حل نکالا اور ان قبائل کو جو کئی صدیوں سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے باہمی احترام اور برادری کے رشتے میں جوڑ دیا اور انہیں یاد دہانی کرائی کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اسلام کی وجہ سے تمہارے درمیان الفت پیدا ہوئی:

"وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا" (3)

یعنی: "اس وقت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور اسلام کی نعمت سے تم ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔"

یہ ان افراد سے خطاب ہے جو سالہا سال ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ اس کے علاوہ، ابراہیمی ادیان کے پیروکاروں سے بھی خصوصی طور پر تعلقات استوار کرنے کے لیے عملی کام کیا۔ ایک طرف رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں سے تعلقات استوار کیے تو دوسری طرف قرآن نے اہل کتاب کو یہ دعوت دی کہ اختلاف نظر اپنی جگہ مگر کچھ مشترکہ چیزیں اسلام اور دوسرے ادیان ابراہیمی میں موجود ہیں ان پر اتفاق کرکے اختلافات کی خلیج کو کم کیا جا سکتا ہے۔(4) اسی طرح اسلام نے خاندانی اکائیوں کو مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہوئے تعلقات کی اور جہتوں کو بھی اہمیت دی ہے اور انہیں معاشرے میں اجاگر کیا ہے۔ جیسا کہ میاں بیوی کے درمیان تعلقات کی

اہمیت، اولاد اور ماں باپ کے درمیان تعلقات کی اہمیت، بہن بھائیوں کے درمیان تعلقات کی اہمیت، خود بہنوں اور بھائیوں کے آپس کے تعلقات شامل ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے اسلام کی نگاہ میں احترام، رواداری اور بہتر تعلقات کو فروغ دینا، ایک پسندیدہ عمل ہے جبکہ فساد، قتل اور غارت گری کو اسلام مذموم عمل قرار دیتا ہے۔آج مختلف ادیان ومذاہب کے درمیان اچھے تعلقات اور روابط کی شدیدی ضروت ہے۔ بہت سارے مسائل ایک دوسرے کے بارے میں غلط فہمیوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لیے اسلام نے مل بیٹھ کر گفتگو کرنے کی دعوت دی تاکہ الجھے ہوئے مسائل حل ہو جائیں۔

اسلام اور غیر مسلموں سے تعلقات

غیر مسلموں کے حوالے سے لکھی گئی بعض تحریریں حقیقت سے زیادہ جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ لہٰذا غیر مسلموں کے حوالے سے اسلام کے مجموعی نقطہ نظر سے آگاہی کے لیے اسلام کے بنیادی منابع، جو قرآن وحدیث ہیں، سے اجمالی یا تفصیلی آگاہی ضروری ہے۔ غیر مسلموں کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کا اگر ہم بغور جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض تعلیمات زمانہ امن سے مربوط ہیں اور کچھ زمانہ جنگ اور استثنائی حالات سے۔ بنابرایں اسلام نے ہر ایک کے لیے الگ قوانین متعارف کرایا ہے ان تمام قوانین کو ایک ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اس کے علاوہ اس بات کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ اگر ہم اس مسئلے کو قرآن کے نقطہ نظر سے پیش کرنا چاہیں تو اس موضوع سے متعلق جتنی آیات ہیں ان سب کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی نتیجہ نکالنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اس موضوع کو مزید دقیق بنانے کے لیے آیات کے شان نزول کو بھی مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔یہی روش سیرت رسول ﷺ کے حوالے سے بھی اپنانے کی ضرورت ہے۔ بہر حال اس حوالے سے جن آیات کو مقام بحث میں بطور استدلال لاتے ہیں وہ یہ ہیں:

"یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ الْیَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِیَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِیَاءُ بَعْضٍ وَمَن یَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ۔" (5)

ترجمہ: " اے لوگو جو ایمان لائے ہو یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق مت بناؤ یہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی ان ہی میں سے ہے۔"

اس آیت کے ذیل میں معاصر ایرانی مفکر مصباح یزدی لکھتے ہیں:

" براساس این اصل رابطه ی مسلمانان۔۔۔۔ اسلام منفی سلطه کافران بر مسلمانان است۔"

" اس اصل کی بناپر مسلمانوں اور کافروں کے درمیان تعلقات اس طرح نہ ہوں کہ مسلمان ان کے ماتحت ہو جائیں اور کافروں کے لیے سیادت اور برتری حاصل ہو بلکہ اس سلسلے میں اسلام اور مسلمانوں کی برتری اور سیادت کو محفوظ بنانا ضروری ہے۔ بہر حال، مسلمانوں اور کافروں کے تعلقات اس طرح نہ ہوں کہ جس سے مسلمانوں کی ذلت کی بو آئے۔ بنا بریں مسلمانوں اور یہودیوں کے دو طرفہ تعلقات میں اگر یہ احساس ہو جائے کہ اس قانون پر عمل نہیں کیا گیا ہے اور اسلامی معاشرہ کافروں کے معاشرے سے وابستہ ہو چکا ہے تو اصل اور قانون یہ تقاضا کرتا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے اس قسم کی وابستگی سے خود کو الگ کرکے مسلمانوں کی برتری واپس لوٹائی جائے۔ کیونکہ اصل کافروں کی برتری کی نفی ہے۔" (6)

مذکورہ مصنف کی باتوں سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ یہودیوں کی سیادت اور برتری کو قبول کیے بغیر ان سے تعلقات قائم کیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ان تعلقات میں مسلمانوں کی ذلت اور وقار کے مجروح ہونے کا کوئی پہلو بھی سامنا نہیں آنا چاہئے۔ اگر اس قسم کا احساس بھی دل میں ہو جائے تو مسلمانوں کو فوراً اس قسم کے تعلقات پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ اور مسلمانوں کو ہمیشہ اس قرآنی اصول کا خیال رکھنا چاہیے کہ یہودیت اور عیسائیت کی ماہیت میں مسلمانوں کو اسلام سے روگردان کر دینے کی ہوس پوشیدہ ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے:

" وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ..." (7)

" اور آپ (ﷺ) سے یہود و نصاریٰ اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتے جب تک آپ ان کے مذہب کے پیرو نہ بن جائیں..."

"لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُواْ الْيَهُودَ..." (8)

" (اے رسول ﷺ) آپ اہل ایمان کے ساتھ عداوت میں یہود اور مشرکین کو پیش پیش پائیں گے..."

" لاَّ يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُوْنِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَن يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّهِ فِي شَيْءٍ إِلاَّ أَن تَتَّقُواْ مِنْهُمْ تُقَاةً..." (9)

" مومنین اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور مددگار ہر گز نہ بناو جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کے لیے بظاہر ایسا طرز عمل اختیار کر جاؤ۔"

" يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لاَ تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُم مِّنَ الْحَقِّ..." (10)

" اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناو تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں۔"

" لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ..." (11)

" تم کبھی یہ نہ پاوگے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے خواہ وہ ان کے باپ ہو یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان..."

" يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّواْ الْكُفْرَ عَلَى الإِيمَانِ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ" (12)

ترجمہ: " اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے باپ اور بھائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں، تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔"

لہٰذا اہل ادیان سے تعلقات برقرار کرتے وقت خوب دقت کر لی جائے کہ مبادا ان تعلقات کی آڑ میں وہ مسلمانوں کو ان کے دین سے روگردان کرنے کی سازش کریں۔ البتہ ان قرآنی ارشادات کو دیکھ کر غیر مسلموں کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کے دین میں دوسرے ادیان کے ساتھ رواداری اور حسن خلق سے منع کیا گیا ہے۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت، مدینہ کی چھوٹی سی مسلم آبادی مستقل خطرے کی حالت میں تھی۔ ان کے وجود کو یہ خطرہ اندرونی اور بیرونی دونوں سطح پر تھا۔ اندرونی خطرہ ان لوگوں سے تھا جنہیں قرآن منافقین کہہ کر پکارتا ہے جو بیرونی عناصر کے ساتھ تعاون کرتے تھے اور مسلم معاشرے کو اندر سے نقصان پہنچانے کی سعی کرتے تھے۔

بیرونی خطرہ مکّہ کے قبیلہ قریش کے علاوہ خاص طور سے مدینہ کے اطراف میں بسے ہوئے یہودی قبائل کی طرف سے محسوس کیا جارہا تھا۔ پہلے تو ان قبائل نے ایک معاہدے پر دستخط کئے اور حضرت محمد ﷺ کی اطاعت کا حلف لیا۔ اس دستاویز کی رو سے شہر کے تمام باشندگان ایک قومیت قرار پائے اور ان کی مذہبی اختلافات کا احترام کیا گیا تھا جس کی قرآن میں تصدیق اور تائید کی گئی ہے۔ مزید برآں، اس دستاویز کے مطابق یہ توقع بھی کی گئی تھی کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان مکر وفریب سے پاک دوستی او رباہمی حسن وسلوک ہوگا دغا وفریب نہیں۔ اس معاہدے پر دستخط کرنے والے تمام فریقین پر ضروری ٹھہرایا گیا کہ کسی بھی اچانک بیرونی حملے کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ بہر حال جیسے جیسے مسلم آبادی میں اضافہ ہوتا گیا اور ان کی طاقت بڑھتی گئی، خود کفیل ہوتے گئے۔ ان یہودی قبائل نے اپنی حمایت اُٹھالی اور مسلمانوں کے خلاف مکّہ والوں سے تعاون اور ان کے ساتھ مل کر سازشیں کرنے لگے۔ اس طرح انہوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی۔

ناگزیر طور پر اس سلسلے میں قرآن اور پیغمبر کی طرف سے ردّ عمل ظاہر ہوا کہ کس طرح مسلمان اس طرح کے قبیلوں اور افراد سے نپٹیں۔ اس تناظر میں ایک یہودی قبیلے کا قلع قمع اور دوسرے کے مدینے سے اخراج کو قرآن اور تاریخ کی کتابوں میں تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ قرآن کی مندرجہ بالا آیتیں ایک خاص تناظر میں پیش کی گئی ہیں اور فطری طور پر ان کا اطلاق ہر یہودی کہلانے والے پر قرآنی منطق کے خلاف شمار ہوگا۔ یہ اس بات سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں سے متعلق قرآن کی آیتوں میں

سے ایک بڑی تعداد ایسی آیات پر مشتمل ہے جن میں ان سے متعلق مفاہمتی لہجہ استعمال کیا گیا ہے اور کئی آیات میں انہیں "یا اھل الکتاب" کہہ کر احترام سے مخاطب کیا گیا ہے۔

بنابریں، یہودیوں کے خلاف حضرت محمد ﷺ کے اقدامات کسی مذہبی احساس برتری کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ ناقابل حل کشیدگی کا نتیجہ تھے۔ چونکہ اس سلسلے میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دو یہودی قبائل کے قلع قمع اور اخراج کے بعد بھی قرآن یہودی پیغمبروں کا احترام کرتا رہا اور مسلمانوں کو اہل کتاب کا احترام کرنے کی تاکید کرتا رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے یہودی گروہ مدینے میں آباد رہے اور بعد میں عیسائیوں کی طرح یہودیوں کو بھی اسلامی حکومت میں پوری مذہبی آزادی حاصل رہی۔

بنابریں، یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ مندرجہ بالا آیتوں کو اگر ان کے ظاہری تناظر میں دیکھیں اور ان آیتوں کے نزول کے پس منظر اور احادیث کے تاریخی پس منظر پر غور نہ کریں تو نتیجے میں مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں ایک بہت ہی منفی تصویر سامنے آئے گی جسے معیاری اور آفاقی تصور نہیں کہا جائے گا۔ جبکہ جب ہم قرآن کی دوسری آیات اور سیرت رسولؐ اور صحابہ کا عمل دیکھتے ہیں تو اس مخمصے سے نکلنے کے لیے ٹھوس اور واضح شواہد سامنے آجاتے ہیں۔ اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو ان آیات میں جن کرداروں کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ اگر آج کے دور میں بھی موجود ہوں تو ان سے رفاقت سے اجتناب کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس سے بھی زیادہ ان آیات کے مفاہیم کو وسعت دی جائے تو جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ یہ کہ جن افراد نے کفر اور شرک اختیار کیا ہے ان کو اپنا دوست، مددگار اور سرپرست بنانے سے منع کیا گیا ہے۔

پس قرآن کی مندرجہ بالا آیات مسلمانوں کو غیر مسلموں سے دوستی کرنے سے روکتی ہیں۔ لیکن ان آیات سے کسی بھی لحاظ سے یہ مفہوم یا نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اسلام اہل ادیان منجملہ یہودیوں سے سماجی، علمی، تجارتی اور باہمی بقاء کی بنیاد پر ہر قسم کے تعلقات قائم کرنے سے روکتا ہے۔ کیونکہ ان آیات کے شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ جن افراد یا کرداروں کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ یہودیوں میں سے کچھ خاص افراد تھے۔ اسی طرح اگر ہم شان نزول سے چشم پوشی بھی کر لیں تو ان آیات سے جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام یہودیوں سے صرف قلبی دوستی سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے یا جس معاشرے میں دونوں ادیان کے پیروکار ساتھ زندگی گزار رہے ہیں اس معاشرے کے ثبات اور پایداری کے لیے باہمی تعلقات استوار کریں تو یہ دوستی کے زمرے میں نہیں آتا۔

بنابریں، قرآن کی مجموعی آیات جو اس موضوع سے مربوط ہیں، اور سیرت رسول ﷺ اور صحابہ کے عمل سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کو بھی اسلام میں بعض بنیادی حقوق حاصل ہیں۔اسلام نے انہیں زندہ رہنے اور معاشی جدوجہد کرکے عزت سے زندگی کرنے کا حق دیا ہے۔ اسی طرح اسلام نے یہودیوں سمیت تمام غیر مسلموں کی عزت و آبرو کی حفاظت کی تعلیم بھی دی ہے۔چونکہ تمام انسانوں کی بنیاد ایک ہی ہے۔ سب کے سب حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں اور انسانیت میں مشترک ہیں۔اسی بناپر انسانیت کے اعتبار سے ان کے جتنے حقوق ہیں وہ ان سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں۔

اگر بطور خلاصہ بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے آیات مذکورہ میں بیان شدہ کردار کے حامل کفار سے موالات سے منع کیا ہے یعنی ان سے قلبی اور دلی محبت سے منع کیا ہے۔ یہ صرف برادر ایمانی سے جائز ہے جبکہ اسلام نے یہودیوں سمیت دیگر غیر مسلموں سے مواسات سے منع نہیں کیا۔ یعنی اگر وہ کفار حربی نہیں ہیں تو ان سے خیر خواہی اور ہمدردی کے ساتھ پیش آسکتے ہیں۔اس کے لیے بہترین دلیل سورہ ممتحنہ کی آیت ۹ ہے جس میں صراحت سے بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالی تم کو منع نہیں کرتا ہے کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاو کرو جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔

اسرائیل کے ساتھ تعلقات

یہاں اس امر کو واضح کر دینا انتہائی ضروری ہے کہ یہودی حکومت، اسرائیل کے ساتھ بائیکاٹ اور اس کے وجود کو تسلیم نہ کرنے اور اس کے ساتھ تعلقات استوار نہ کرنے کا معاملہ اس بنیاد پر نہیں ہے کہ اسلام سرے سے یہودیوں کے ساتھ ہر طرح کے رابطے سے روکتا ہے۔ بلکہ اسرائیل کے ساتھ تعلقات قائم نہ کرنے کا اصل سبب، یہ ہے کہ اسرائیلی حکومت کی ماہیت میں اسلام دشمنی، مسلم کشی اور مسلمانوں کی سرزمینوں پر قبضہ جمانا اور مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرنا ہے۔ لہٰذا اسرائیلی حکومت کا معاملہ عام یہودیوں سے جدا ہے۔ اگر اس حکومت کا بس چلے تو پورے عالم اسلام پر قبضہ جمالے۔ بنابرایں، جو لوگ اسرائیل سے تعلقات بڑھانے یا اسرائیل کے ناپاک وجود کو تسلیم کرنے کی باتیں کرتے ہیں، وہ یا تو اسرائیلی حکومت کی ماہیت سے غافل ہیں یا ان کا اسلام سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہے۔

اہل ادیان سے تعلقات کا فائدہ

بہر صورت، اسلام نے تمام انسانوں اور اہل ادیان کے ساتھ تعمیری روابط بنانے کی تعلیم دی ہے۔ دراصل، اسلام پوری انسانیت کے لئے نسخہ کیمیا ہے۔ اور مسلمانوں کا یہ فریضہ ہے کہ پوری دنیا کے انسانوں سے میل جول رکھیں تاکہ ان تک اسلام کا پیغام پہنچ سکے۔ اگر مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ رابطہ استوار ہو گا تو اس کا مستقیم فائدہ یہ ہوگا کہ وہ مسلمانوں کی قربت اور ان کے حسن سلوک سے متاثر ہوکے مسلمانوں کے قریب ہو جائیں گے۔اس کے علاوہ اسلام نے یہودیوں سمیت غیر مسلم طبقے کے ساتھ ظاہری خوش خلقی اور ادب و احترام سے بھی منع نہیں کیا۔بلکہ اگر یہ رابطہ مسلمانوں کے مفاد میں ہو یا مسلمانوں کو کسی متوقع نقصان سے بچانے کے لیے ہو تو یہ وجوب کی حد تک جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کو ان اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

اجتماعی تعلقات

اسلام غیر مسلموں کو بالخصوص ابراہیمی ادیان کے پیروکاروں سے تعلقات کو اہمیت دیتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت طیبہ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ آپؐ نے اپنی زندگی میں اور بالخصوص اپنے دور حکومت میں زندگی گزارنے والے یہودیوں کے ساتھ احترام اور لطف کے ساتھ پیش آتے تھے۔ جیسا کہ جابر ابن عبداللہ انصاری فرماتے ہیں کہ ایک جنازہ ہمارے پاس سے گزرا۔ پیغمبر ﷺ اس جنازے کے احترام میں کھڑے ہو گئے ہم بھی پیغمبر ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد ہم نے پیغمبر سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے؟آپؐ فرمانے لگے کہ کیا یہ کسی انسان کا جنازہ نہیں؟جب بھی کسی جنازے کو دیکھو تو احتراماً کھڑے ہو جاؤ۔(13)

اسی طرح سیرت پیغمبر ﷺ سے ہمیں یہ بھی درس ملتا ہے کہ اجتماعی روابط میں حسن برقرار رکھنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تحائف کے تبادلے کی ضرورت ہے تاکہ اجتماعی تعلقات کے لیے مضبوط بنیاد فراہم ہو۔ پیغمبر اپنے ہمسائے میں رہنے والے یہودیوں کے ساتھ یہ روش برقرار رکھے ہوئے تھے۔ اسی بناپر ایک یہودی عورت نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوے بکرے کی ایک ٹانگ کو زہر آلود کرکے پیغمبر اکرم ﷺ کو بھیجا تاکہ پیغمبر مسموم ہو جائیں۔(14)

اسلام کی نگاہ میں اجتماعی تعلقات کے تصور میں خدمت خلق کا ایک بنیادی کردار ہے۔ اسلام صرف مسلمانوں سے نہیں، بلکہ دیگر تمام ادیان کے پیروکاروں کے ساتھ نیکی کا حکم دیتا ہے:

" لَا يَنْهَاكُمُ اللهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ (15)

یعنی: "جن لوگوں نے دین کے بارے میں تم سے جنگ نہیں کی اور نہ ہی تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے، اللہ تمہیں ان کے ساتھ احسان کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا..."

لہٰذا جب تک غیر مسلموں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف کوئی خلاف قانون اقدام سامنے نہ آئے تو ان کے ساتھ بہتر اور مسالمت آمیز رویہ اپنایا جا سکتا ہے اور ان کے تمام حقوق کا خیال بھی رکھا جائیگا۔(16) اس کے علاوہ حضرت علیؑ کی وہ نصیحت بھی اس سلسلے میں نمایاں حیثیت کی حامل ہے جو آپؑ نے مالک اشتر کو مصر کے لوگوں کے بارے میں کی تھی۔ جس میں فرمایا تھا کہ لوگوں سے مہربانی اور نرمی سے پیش آجاؤ چاہے وہ آپ کے ہم مذہب ہوں یا انسانیت میں تمہارے ساتھ شریک ہوں۔(17)اس کے علاوہ حدیث میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ اگر کوئی یہودی ہمسائے میں رہتا ہو تو اس سے نیکی سے پیش آیا جائے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: ان جالسك يهودي فاحسن مجالسته (18)

یعنی: "اگر کوئی یہودی آپ کا ہم نشین ہو تو اس سے بھی نیکی سے پیش آؤ"۔

اسی طرح صحابہ کرامؓ کی زندگی اور ان کی عملی روش کی روشنی میں اس مسئلے کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام نے اس پر سختی سے عمل کیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمر نے ایک بار ایک بکری ذبح کرائی، غلام کو ہدایت کی کہ وہ سب سے پہلے پڑوسی کو گوشت پہنچائے، ایک شخص نے کہا حضور! وہ تو یہودی ہے، آپؐ نے فرمایا یہودی ہے تو کیا ہوا، پھر کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جبرئیل نے مجھے اس قدر اور مسلسل وصیت کی کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ وہ پڑوسیوں کو وراثت میں حصہ دار بنادیں گے۔(19)

اسی طرح اسلام نے اجتماعی روابط کی تحکیم کی تاکید کی ہے۔ حتی کہ غیر مسلموں کی عیادت کا بھی حکم دیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ : ان النبی عاد یهودیا فی مرضه (20) یعنی: "جب ایک یہودی بیمار پڑا تو پیغمبر ﷺ نے اس کی عیادت کی۔" بنابرایں، اجتماعی تعلقات کے حوالے سے اسلام کی ان تعلیمات کو مشعل راہ قرار دے کر آج بھی غیر مسلموں کے ساتھ اسی انداز میں برتاو کیا جاسکتا ہے جو ہمیں رسول

اسلام ﷺ کی سیرت سے درس ملا ہے ۔آج کے دور میں ضرورت اس بات کی ہے کہ سیرت رسول ﷺ کے ہر پہلو کو دنیا کے سامنے بہتر انداز میں پیش کیا جائے جس کے بعد کوئی بعید نہیں کہ مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان آپس میں جو غلط فہمیاں ہیں ان میں کافی حد تک کمی آسکتی ہے۔

کاروباری تعلقات

کاروبار، خرید وفروخت، لین دین انسانی زندگی کا لازمی جز ہے۔ لہٰذا کاروباری روابط جس طرح مسلمانوں کے ساتھ صحیح ہیں، اسی طرح غیر مسلم افراد کے ساتھ بھی جائز ہیں۔ شرعی حدود میں رہتے ہوئے یہودیوں سے بھی تجارتی تعلقات رکھے جاسکتے ہیں۔ اس کے نمونے ہمیں مسلمانوں کی تاریخ میں جا بجا مل جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں بھی مدینہ کی تجارت کا بڑا حصہ یہودیوں کے ہاتھ میں تھا۔ مسلمان یہودیوں کے ساتھ کاروباری تعلقات رکھتے تھے اسی طرح خلفا کے دور میں اور اس کے بعد بنی عباس اور بنی امیہ کے دور سمیت قرون وسطی میں بھی یہودیوں سے مسلمانوں کے کاروباری مراسم کے نمونے مل جاتے ہیں۔

عصر حاضر میں بھی صہیونی ریاست کے علاوہ یہودیوں سے کاروبار کرنے کو مسلمان عیب شمار نہیں کرتے۔ کیونکہ اسلام میں کفار حربی اور غیر حربی کے ساتھ کاروبار میں فرق ہے۔ کفار حربی سے کاروبار میں یہ امکان پایا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے اس کو کوئی فائدہ حاصل ہو جائے۔ بنابرایں، ان سے کاروبار میں احتیاط برتی جاتی ہے۔(21) اسرائیلی ریاست اس وقت تقریباً تمام مسلمانوں کی نگاہ میں دارالحرب کے زمرے میں آتی ہے، لہٰذا ان سے کاروبار کرنا جائز نہیں ہے۔ یہودیوں سے لین دین کے حوالے سے ایک روایت بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

ان النبی (ص) اشتری طعاما من یهودی الی اجل و رهنه درعه من حدید (22)

یعنی: "رسول اکرم ﷺ نے ایک یہودی سے ایک مدت کے لیے غلہ خریدا اور اس کے پاس اپنی لوہے کی ذرہ رہن رکھی۔"

اس سلسلے میں اس بات کو یاد رکھنے کی بھی ضرورت ہے کہ اسلام نے جس طرح ان کی جان کو محترم قرار دیا اسی طرح ان کے اموال کو بھی محترم قرار دیتے ہوے بغیر اجازت کے ان سے استفادہ کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے(23) مجموعی طور اسلام اقتصادی اور تجارتی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ کیونکہ یہ

دونوں ایسے کام ہیں جن کے ذریعے اجتماعی نظام اور فرد کی ذاتی زندگی کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اس کی اتنی اہمیت ہے کہ اگر کوئی شخص آخرت کی خاطر اور اپنے اُمور کی خاطر اقتصادی و مادی سرگرمیوں سے ہاتھ اٹھائے تو اسلام اس کی سختی سے مذمت کرتا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں غیر مسلموں کے ساتھ تجارتی اور اقتصادی تعلقات قائم کرنے میں کوئی ممانعت نہیں۔ خنزیر، کتا، موسیقی کے آلات اور قمار جیسی چیزیں جو کی اسلام کی نگاہ میں حرام ہیں یا ان کی کوئی ارزش اور اہمیت نہیں ہے، دیگر اشیاء کا معاملہ اور لین دین تمام اہل ادیان اور گیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔ البتہ ممنوعہ چیزوں کا کاروبار نہ صرف غیر مسلموں کے ساتھ بلکہ مسلمانوں کے ساتھ بھی جائز نہیں ہے۔ (24)

اس کے برخلاف اسلام یہودیوں کے ساتھ مورد نیاز چیزوں کے کاروبار کو جائز قرار دیتا ہے۔ اس کے لیے ہمارے پاس بعنوان مثال خود رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ ہے۔ آپ نے مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ اقتصادی روابط قائم کیے تھے حتی کہ تاریخ میں یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ پیغمبر ﷺ نے ان سے قرضہ بھی لیا تھا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ پیغمبر ﷺ نے ایک یہودی بنام (زید بن سعنہ) سے قرض لیا تھا جب اپنا قرض لینے کے لیے وہ پیغمبر کی خدمت میں آئے تو اس نے آپ کی شان میں گستاخی کی۔ حضرت عمر یہ دیکھتے ہوے غصے میں آگئے اور انہیں قتل کرنا چاہا تو پیغمبر نے انہیں اس عمل سے روکا اور فرمایا ان کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور فُلاں جگہ سے ان کا قرض ادا کرو اور اضافی بیس صاع کھجور بھی انہیں دے دو۔ پیغمبر کی اس خوش اخلاقی کو دیکھ کر وہ مسلمان ہو گیا۔ (25) اس کے علاوہ اسلامی تعلیمات اور مقررات میں یہودیوں سمیت دیگر غیر مسلموں کے ساتھ مسالمت آمیز فضا کو بہتر بنانے کے لیے فقراء کو زکاۃ سے اقتصادی امداد فراہم کرنے کی سفارش کی ہے اور اس کے لیے ایک خاص حصہ بھی معین کیا ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ (26)

یعنی: ”بس صدقات تو فقراء، مساکین، صدقات کو جمع کرنے والوں اور مولفہ قلوب کے لئے ہیں۔“

اس کی وجہ، تالیف قلوب بیان کیا گیا ہے یعنی مسلمانوں کے حوالے سے قائم منفی سوچ ختم ہو جائے۔ آج بھی مسلمان اسلامی تعلیمات کے اس فراموش شدہ رکن کو زندہ کرکے دونوں ادیان کے درمیان تعلقات کے قیام کے لیے ایک پل قائم کر سکتے ہیں۔ اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو اقتصادی تعلقات یہودیوں کے ساتھ بہتر تعلقات استوار کرنے کے لیے ایک بہترین دریچہ ہے جس کے کھل جانے سے مسلمانوں اور

یہودیوں کے درمیان تعلقات کی راہ میں حائل بہت سی رکاوٹیں دور ہو سکتی ہیں یہی اقتصادی اور تجارتی تعلقات ہیں جن کے ذریعے اسلام ہندوستان اور چین جیسے دور دراز علاقوں تک پھیل گیا۔

۳۔ علمی اور ثقافتی تعلقات

اسلام کی نگاہ میں ہر وہ علمی اور ثقافتی سرگرمی جو معاشرے میں نشاط اور افراد کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کرنے کا سبب بنے، قابل قبول ہے اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔یہی علم اگر انسانی معاشرے کے لیے مضر ہو تو اسلام اسے ممنوع قرار دیتا ہے بعض افراطی نظریے کے حامل افراد جو کہ آج کل ہمارے معاشرے میں رہتے ہیں ان کا یہ کہنا ہے کہ ہر وہ علم اور ثقافتی بنیادیں جو مغرب سے آئیں ان سے مسلمانوں کو اجتناب کرنے کی ضرورت ہے۔اسی طرح کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو مغربی اقدار اور ثقافت کو ہی انسان کی ترقی کی بنیاد قرار دیتے ہیں یعنی اگر ترقی کرنی ہے تو تمام حدود اور قیود کو پامال کرکے مکمل طور پر مغربی طرز زندگی اپنانی چاہئے تاکہ انسان مختلف علمی شعبوں میں مغرب کی طرح ترقی کر سکیں۔

ان دو نظریات کے مقابلے میں اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر علمی اور ثقافتی سرگرمیاں مفید ہوں توانہیں قبول کیا جاسکتا ہے چاہے مغرب میں ہو یا مشرق میں۔ جیسا کہ معروف حدیث ہمارے سامنے بطور شاہد موجود ہے: اطلبوا العلم ولو کان بالصین(27) رسول ﷺ نے یہ اس وقت کہا تھا جب اسلام ابھی تک چین پہنچا بھی نہیں تھا۔اسی طرح حضرت علیؑ کا ایک قول بھی ہے: الحکمۃ ضالۃ المومن فخذ الحکمۃ و لو من اھل النفاق(28) یعنی: "حکمت مومن کا گمشدہ ہے حکمت کو لے لو اگرچہ وہ منافق سے ہی کیوں نہ ہو۔"

ان ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو دوسرے ادیان کے ماننے والوں کے ساتھ علمی طور پر تعلقات کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس کا ایک غیر مستقیم فائدہ یہ ہے کہ ان علمی روابط سے دوسرے شعبوں میں بھی تعاون اور ہمکاری کے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں۔اسلام کے ان تاکیدی فرامین کی وجہ سے ہی مسلمانوں نے ہمیشہ اپنی علمی پیشرفت کو دوسرے ادیان کے پیروکاروں تک منتقل بھی کیا ہے اور ان سے مختلف علوم کی تحصیل میں استفادہ بھی کیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے علم ریاضی، نجوم، طب اور علوم طبیعی کے حصول میں یونان کے ساتھ دوطرفہ تعلقات بنائے رکھے

تھے(29)۔اسی طرح یہ بھی مشاہدہ کر رہے ہیں کہ مسلمانوں نے مختصر مدت میں یونان، ہندوستان اور ایران سے جن علوم میں استفادہ کیاان میں وہ ماہر بن گئے اور پوری دنیا کی ان علوم میں رہنمائی کرنے لگے۔ چنانچہ جابر بن حیان کی کیمیاکے بارے لکھی گئی کتاب ۱۱۴۶ میں لاطنیی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔اسی طرح ایک اور مسلمان طبیب ودانشور محمد بن زکریارازی ہے جن کی کتابیں الجامع، المدخل، المرشداور المدخل الی الطب کے قرون وسطی میں کئی بار لاطینی زبان میں ترجمہ کیے گئے۔(30) پیغمبر اکرم ﷺ کے ان ارشادات اور مسلمانوں کی عملی روش سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اسلام مسلمان کے دوسرے ادیان کے پیروکاروں کے ساتھ علمی اور مثبت ثقافتی تعلقات قائم کرنے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔اس سلسلے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا ہے۔

مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات کا محور

اس میں کوئی شک نہیں کہ دورِ جدید میں آنے والی کوئی بھی مثبت یا منفی تبدیلی میں مسلمانوں اور یہودیوں کا بڑا کردار ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت قدرتی وسائل سے مالا مال والے علاقے میں رہنے کی بناپر مسلمانوں کے حوالے سے دور جدید کی عالمی طاقتیں اور پوری دنیا زیادہ حساس ہے۔اسی طرح مشرق وسطی میں صہیونی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد عالمی اقتصاد اور سیاست میں صہیونی یہودیوں کی بڑھتی ہوئی قدرت اور طاقت نے انہیں آج کی دنیا میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کرنے والی قوم کے طور پر سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

اس سارے منظر نامے میں ایک بات جو سب کو سوچنے پر مجبور کر رہی ہے وہ یہ کہ نسلی بنیادوں پر قائم ہونے والی صہیونی ریاست کو کیا ہم عالمی یہودیت کی نمائندہ ریاست کہہ سکتے ہیں ؟اس کا جواب جزئی طور پر نفی میں دے سکتے ہیں۔ اس لیے کہ یہودیوں میں سے ایک خاص طبقہ ہی اس ریاست کی سیاسی، اقتصادی اور دیگر پالیسیوں سے متفق ہے جبکہ دوسرا طبقہ اس ریاست سے نفرت کرتا ہے۔

اسی طرح کیا مسلمانوں میں موجود انتہا پسند اور ایک خاص طرز فکر کے حامل مسلمانوں کو تمام مسلمانوں کا نمائندہ کہا جاسکتا ہے؟اس سوال کا جواب بھی پہلے کی طرح منفی ہے۔ بنابریں اگر مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک دوسرے کی بقاکے لیے تعلقات استوار کرنا ہیں تو اس کے لیے دونوں ادیان کی تعلیمات میں جو مشترکات ہیں انہیں سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ دونوں

ادیان کے درمیان بہت سی چیزیں مشترک ہیں اس فرق کے ساتھ کہ بعض ادیان میں یہ مشترکات کچھ زیادہ ہیں بعض میں کم جیسا کہ اکثر اخلاقی مسائل میں یہ دونوں ادیان مشترکہ نظر رکھتے ہیں۔ سب ہی سچائی، وعدے کی پاسداری اور ستم دیدہ افراد کی مدد جیسے اخلاقی صفات کو اچھا سمجھتے ہیں۔

اسی طرح کچھ ایسی چیزیں ہیں جن کو بعض قبول کرتے ہیں جبکہ بعض اسے قبول نہیں کرتے۔ البتہ اس معاملے میں اس بات کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ یہ اختلاف کسی لحاظ سے دشمنی اور جدال کا سبب نہیں بننا چاہیئے۔ کیونکہ خود ایک دین میں ہی اس کے پیرکاروں کے درمیان اختلاف نظر کی بہت ساری مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اس لیے ایک قابل قبول حل کی جانب قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔ مشترکات کا کردار ادیان ابراہیمی کے درمیان بہتر تعلقات اور مسالمت آمیز ہمزیستی کی فضا فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ قرآن بھی اس نکتے کی جانب اشارہ کر رہا ہے:

" قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا...(31)

یعنی: " کہہ دیجے: اے اہل کتاب! اس کلمے کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ بنائیں..."

مذکورہ آیت میں جو پیغام ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے جو تمام ادیان بالخصوص ابراہیمی ادیان کے درمیان تعلقات بہتر بنانے کے لیے ایک معقول راہ فراہم کرتا ہے۔ اگر ادیان ابراہیمی تمام مقدس اور اجتماعی معاملات پر اتفاق نہیں کر سکتے ہیں تو کم از کم اہم اور کلیدی معاملات پر جن کے حوالے سے سب میں اتفاق رائے پایا جاتا ہے، اتفاق ہو سکتا ہے۔ یہ اتفاق یقیناً دوسرے بڑے مسائل کے لیے راہ کو کھول سکتا ہے۔ ہم جب آسمانی ادیان کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے درمیان مشترکات صرف ایک موضوع تک منحصر نہیں ہیں عقائد اور اخلاقی مباحث سے لے کر بعض احکام جیسا کہ نماز، روزہ اور قربانی میں بھی ہم میں اتفاق ہے۔ چنانچہ **ایک اسکالر ڈاکٹر عبدالرحیم گواہی لکھتے ہیں:**

" تورات و انجیل و قرآن هر سه از آغاز و انجام و مبدا، معاد جهان سخن گفته اند و آدمیان را ترك لذتها و شهوت های دنیا و عشق به زندگی جهان آخرت تشویق نموده اند---هرچند با اختلاف و تفاوت آن پاداش و کیفرها۔" (32)

یعنی: " توریت، انجیل اور قرآن تینوں اس جہان کے آغاز اور انجام کے بارے میں بتا چکے ہیں اور بنی نوع انسان کو دنیاوی لذتوں کو چھوڑ کے اخرت کی زندگی سے عشق اور دل لگانے کے لیے ابھارتے ہیں۔۔۔ دنیا میں موجود تمام ادیان اخلاقی اور انسانی مسائل میں مشترکہ نکات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں اگرچہ ان میں کچھ کمی اور زیادتی کا پہلو موجود ہے۔ (اس کے علاوہ) تمام ادیان انسانوں کے اچھے اور برے اعمال کے لیے دوسرے جہان میں ثواب و عقاب کے پہلو کو معین کر چکے ہیں اگرچہ اس سزا اور جزا میں تفاوت اور اختلاف کے پہلو کے ساتھ۔"

قرآن کریم میں بعض ایسے احکام بیان ہوئے ہیں جو دوسرے ابراہیمی ادیان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن کریم کا حکم ہے کہ:

1. أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا۔ کہ کسی چیز کو خدا کا شریک نہ بنانا۔
2. وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا۔ اور ماں باپ (سے بد سلوکی نہ کرنا بلکہ) اچھا سلوک کرتے رہنا۔
3. وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُم مِّنْ إِمْلَاقٍ۔ اور ناداری (کے اندیشے) سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا۔
4. وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔ اور بے حیائی کے کام ظاہر ہوں یا پوشیدہ ان کے پاس نہ بھٹکنا۔
5. وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللهُ إِلَّا بِالْحَقِّ۔ اور کسی نفس کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے ناحق قتل نہ کرنا۔
6. وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ۔ اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جانا مگر ایسے طریق سے کہ بہت ہی پسندیدہ ہو یہاں تک کہ وہ جوانی کو پہنچ جائے۔
7. وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ۔ اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا کیا کرو۔
8. وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ۔ اور جب (کسی کی نسبت) کوئی بات کہو تو انصاف سے کہو گو وہ (تمہارا) رشتہ دار ہی ہو۔
9. وَبِعَهْدِ اللهِ أَوْفُوا۔ اور خدا کے عہد کو پورا کرو۔
10. وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ۔ اور یہ کہ میرا سیدھا رستہ یہی ہے تو تم اسی پر چلنا اور اور اُن رستوں پر نہ چلنا کہ (جن پر چل کر) خدا کے رستے سے الگ ہو جاؤ گے۔ (33)

ان آیتوں میں دس ایسی چیزیں بیان ہوئی ہیں جو کم و بیش یہودیوں کے احکام عشرہ میں بیان ہوئی جیسا کہ اس آیت کی تفسیر میں **ناصر مکارم شیرازی لکھتے ہیں:**

"این آیین دھگانه اختصاص به آیین اسلام ندارد بلکه در همه ادیان بوده است اگرچه در اسلام به صورت گسترده تر مورد بحث قرار گرفته است و درحقیقت همه آنها از فرمانهای است که عقل و منطق به روشنی آنها را درك میکندو به اصطلاح از مستقلات عقلیه اند و لذا در قرآن مجیدو در آیین انبیا دیگرنیزاین احکام کم و بیش دیده میشوند۔" (34)

یعنی: "یہ دس احکام صرف اسلام کے ساتھ مختص نہیں ہیں تمام ادیان میں یہ موجود ہیں (ہاں یہ بات ضرور ہے کہ) اسلام میں یہ احکام وسیع پیمانے پر مورد بحث قرار دیئے گئے ہیں اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو یہ ایسے احکام ہیں کہ جنہیں عقل اور منطق بخوبی درک کرتی ہے دوسرے معنی میں یہ مستقلات عقلیہ میں سے ہیں۔اسی لیے قرآن میں دوسرے انبیاء کے جو قوانیں مذکور ہیں ان میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔"

بنابریں، یہ احکام صرف مسلمانوں میں موجود نہیں، بلکہ کئی دیگر ابراہیمی ادیان کے پیروکاروں کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا ان جیسے احکام اور قواعد کو ادیان کے درمیان مسالمت آمیز تعلقات قائم کرنے کے لیے ایک پل کے طو پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔الحاد سے متاثر موجودہ دور میں تمام الٰہی ادیان کے پیروکاروں کو مشترکات پر جمع ہونے اور انسانیت کے مسائل کا مشترکہ حل ڈھونڈنے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک یہودیت اور اسلام کے درمیانمشترکات کا تعلق ہے تومزکورہ بالا احکام کے علاوہ بھی کئی امور میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ:

الف۔ دونوں ادیان معاد پر عقیدہ رکھتے ہیں۔

ب۔ دونوں ادیان ایک شخصیت (حضرت ابراہیمؑ خلیل) کو اپنے لیے نمونہ قرار دیتے ہیں۔

ج۔ دینی تعلیمات کو دونوں ادیان وحی الٰہی قرار دیتے ہیں۔

د۔ نبوت اور رسالت پر دونوں عقیدہ رکھتے ہیں۔

ہ۔ دونوں ادیان آخرالزمان میں منجی بشریت کی آمد پر عقیدہ رکھتے ہیں۔

و۔ دنیا میں قیام امن کو دونوں ادیان کے پیروکار ضروری سمجھتے ہیں۔
ز۔ اخلاقیات کے بہت سے اصول مشترک ہیں۔
ک۔ دونوں ادیان صلح اور آزادی پر عقیدہ رکھتے ہیں۔
ل۔ دونوں ادیان سماجی عدالت کو معاشرے کی ضرورت سمجھتے ہیں۔(35)

دونوں ادیان کے درمیان تعلقات میں اس بات کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ آپس میں ہمزیستی اور بہتر تعلقات کا مطلب یہ نہیں کہ مخالف فریق کی ہر جائز اور ناجائز بات کے سامنے سر تسلیم خم کیا جائے۔ بہتر تعلقات کا مطلب یہ ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک اپنے لیے حاصل تمام شخصی آزادی اور حقوق کی پاسداری کرتے ہوئے معاشرے کے امن اور پائیداری کے لیے باہم جدوجہد کرنے کا مصمم ارادہ کر لیں اور ایسے تمام خطرات کے لیے جو دونوں ادیان اور اس کے پیروکاروں کو درپیش ہیں باہم مل بیٹھیں۔

اس قسم کے تعلقات کے نمونے ہمیں مدینہ میں مل جاتے ہیں جہاں پیغمبر اکرم ﷺ کے دور حکومت میں مسلمان اور یہودی باہم زندگی گزار رہے تھے حتی کی منافقین، جو اس زمانے ہیں مسلمانوں کے لیے اپوزیشن کی حیثیت رکھتے تھے، بھی مسلمانوں کے ساتھ مسالمت آمیز زندگی گزار رہے تھے۔ اس کے علاوہ، مشرکین بھی جو مسلمانوں کے سخت دشمن شمار ہوتے تھے، تمام شہری حقوق سے بہرہ مند تھے اور ان کے ساتھ لکم دینکم و لی دین(36) کے مطابق سلوک کر رہے تھے۔ بہر حال اسلام اور یہودیت میں بہتر تعلقات کے لیے جن چیزوں کو محور قرار دیا جاسکتا ہے ان میں سے مندرجہ ذیل یہ بھی ہیں:

الف: ایک دوسرے میں مفاہمت کی فضا قائم کرنے اور ایک دوسرے کو درک کرنے کے لیے تعلقات قائم کئے جا سکتے ہیں چونکہ آج کے دور میں بہت ساری مشکلات ایک دوسرے کو منفی انداز میں درک کرنے سے پیدا ہوتی ہے جس کو قرآن نے سوظن کہہ کے اسے گناہ کے زمرے میں قرار دیا ہے۔ چونکہ اس سے ایک دوسرے کے بارے میں منفی تاثر پیدا ہوتا ہے جس کا آخری نتیجہ جدال اور فساد کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ فساد ہر ایک کے نزدیک مذموم عمل ہے اس کی طرف لے جانے والے ہر عمل کو مذہب نے ممنوع قرار دے کر اس کے ارتکاب سے لوگوں کو روکا ہے۔

ب: انسانی معاشرے کو موجودہ بحرانوں سے نکالنے کی خاطر مل کر کوشش وتلاش کرنے کے لیے بھی تعلقات قائم کئے جا سکتے ہیں۔ اس وقت انسانی معاشرے کو جو مشکلات اور خطرات لاحق ہیں وہ ناقابل

شمار ہیں۔ ان تمام مشکلات پر انفرادی سطح پر قابو نہیں پایا جاسکتا ہے اس لیے دونوں ادیان کے تعلقات قائم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اگر اس پر مکمل کنٹرول نہیں کر سکیں تو کم از کم ان پر ایک حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔اخلاقیات سے لے کر عقائد کی حد تک ہم مشترکہ مشکلات رکھتے ہیں چونکہ آج دنیا نے تیز رفتار اقتصادی ترقی کر کے انسانوں کو اتنا مصروف رکھا ہوا ہے کہ انہوں نے دین کو عملی طور پر اپنی انفرادی، اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی زندگی سے الگ کر دیا ہے جو در حقیقت فطرت کے خلاف بغاوت کے زمرے میں آتا ہے۔ اس خلاف فطر ت عمل سے روکنے کے لیے فطری اصولوں کی طرف بشر کی رہنمائی کی جاسکتی ہے۔

ج: دونوں ادیان کے درمیان درپیش مختلف بحرانوں کو کم کرنے کے لیے بھی ایک دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھایا جا سکتا ہے۔ دور جدید میں دونوں ادیان کو درپیش مشکل یہ ہے کہ ان کے درمیان موجود اخلاقی اور معنوی تعلیمات کو پس پشت ڈالا گیا ہے جس کی وجہ سے دور جدید میں ہمیں دین ستیزی کی لہر کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔اس بحران کو فی الفور قابو میں رکھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جدید دنیا میں قائم سسٹم میں مشترکہ اخلاقی تعلیمات کو بھی اس کا حصہ بنایا جائے تاکہ آج کے انسان جس طریقہ سے مسلسل اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو رہا ہے اس کا کوئی قابل قبول حل نکل جائے۔اس کے علاوہ دور جدید میں دونوں ادیان کو جس بحران کا سامنا ہے وہ مختلف عناصر کا دین کی شکل وصورت میں بگاڑ پیدا کرنا ہے جس کی وجہ سے دین کی اصلی شکل اور صورت سے دنیا آگاہی سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اس صورتحال سے نکلنے کے لیے بھی مشترکہ کوششیں کام میں لائی جا سکتی ہیں۔اس کے علاوہ دونوں ادیان کے لیے جو چیز بحران کی شکل اختیار کر چکی ہے وہ دونوں ادیان میں موجود کچھ افراد کے ہاتھوں ایک دوسرے کے مذہبی مقدسات کی توہین ہے جس کی وجہ سے بھی بہت سے معاملات ابتری کی طرف جاتے ہیں اگر ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں گے تو ان تمام مسائل پر دونوں ادیان کے سنجیدہ افراد قابو پا سکتے ہیں۔(37)

*****

حوالہ جات

1۔سورہ نحل آیۃ 97

2۔ڈاکٹر وہبہ الزحیلی، العلاقات الدولیۃ فی الاسلام ص ۳، دارالسلام ریاض

3-سورہ بقرہ

4۔سورہ آلِ عمران، آیت ۶۴

5-سورہ مائدہ، آیت ۵۱

6-مصباح یزدی، اخلاق در قرآن، ، ج ۳، انتشارات اطلاعات، تہران، ۷۰ ۱۳، ص ۴۱۵

7-سورہ بقرہ، آیت ۱۲۰

8-سورہ مائدہ، آیت ۸۲

9-سورہ آلِ عمران، آیت ۲۸

10-سورہ ممتحنہ، آیت ۱

11-سورہ مجادلہ، آیت ۲۲

12-سورہ توبہ، آیت ۲۳

13-عفیف عبدالفتاح، روح الدین الاسلامی، دارالکتب، لبنان، ص ۲۶۲

14-سنن ابی دوود، کتاب الدیات، حدیث ۳۹۱۱

15-سورہ ممتحنہ، آیت ۸

16۔ تسنیم، تفسیر قرآن کریم ج ۵، ص ۷۵

17۔عبدہ، محمد، ۱۴۱۲ق، نہج البلاغہ، قم، دار الذخائر۔ ج ۳ ص ۸۹

18 من لایحضرہ الفقیہ، ج ۴، ص ۴۰۴،

19۔سنن ابو داوود، کتاب الادب، ۲۳۸۵

20۔تنبیہ الغافلین باحادیث سیدالانبیاوالمرسلین، ج۱، ص ۸۰۹، ابواللیث نصر بن محمد بن احمد بن ابراہیم سمرقندی دارابن کثیر دمشق۔ بیروت ۱۴۲۱

21۔جنگ و صلح در قرآن، دکتر مجید خدوری، ناشر کلبہ شروق، قم، ۱۳۹۱

22۔ صحیح بخاری، کتاب رہن باب رہن درعہ، حدیث: ۲۵۰۹

23۔جلال الدین سیوطی، بیروت، دار الفکر ۱۴۰۱ق الجامع الصغیر فی احادیث البشیر والنذیر، ج ا ص ۴۶۸،
24۔کتاب احیاعلوم الدین، غزالی، ج ۲، ص ۶۰، قاہرہ، ۱۳۳۹ھ
25۔البدایہ والنہایہ، ج ۳، ص ۵۰۷، ابن کثیر، قاہرہ ۱۳۵۱ھ
26۔سورہ توبہ ۶۰
27۔بحار الانوار، ص ۱۸۰، ج ا، مجلسی محمد باقر، موسسہ الوفا، بیروت، ۱۴۰۴ھ
28۔نہج البلاغہ، حکمت ۸۰
29۔تاریخ علوم در اسلام، تقی زادہ سید حسن، ص ۱۱، تہران، فردوس، ۱۳۷۳
30۔تاریخ تمدن اسلام، ص ۸، علی اصغر، تہران انتشارات بنیاد، ۱۳۶۵ش
31۔سورہ آل عمران، آیت ۶۴
32۔درآمدی بر تاریخ ادیان در قرآن، دکتر عبد الرحیم گواہی، ص ۲۱۹، نشر دفتر فرہنگ اسلامی، ۱۳۷۴ش
33۔سورہ انعام، آیت ۱۵۱۔ ۱۵۳
34۔نمونہ، ج ۶ ص ۳۲۔ ۳۳، مکارم شیرازی ناحر، دار القرآن، قم ۱۳۷۳ش
35۔ترابی، علی اکبر ۱۳۸۳ش، مشترکات بین ادیان زمینہ گفت گو، مجلّہ اندیشہ حوزہ، ش ۴۶
36۔کافرون ۶
37۔ گفتگو در قرآن، محمد مہدی نیا، رواق اندیشہ، شمارہ ۲۹

DISJOINTED LETTERS:
AN ANALYTICAL STUDY OF DIFFERENT VIEWS (4)

By: ***Saqib Akbar*** [*]
ukhuwat@gmail.com

Key Words: *Names of prophet, numbers, qur'anic oaths, Ha'i Ibin-e-Akhtab.*

Abstract:

A lot of work has been done on disjointed letters in Arabic and Persian wherein the views of philosophers are of great significance. In Urdu, on the contrary, a little work has been done. Even, some people have considered it wastage of time to contemplate about them. However, these letters have appeared in the beginning of many chapters in Quran and contain amazing meanings. Keeping in mind the importance of these letters, we have made a little attempt to draw the attention of scholars and intellectuals towards the issue.

In the previous parts of the article, twelve views had been discussed. Further views are presented in this part. The thirteenth view regarding the disjointed letters is that these are the names of the Holy Prophet (PBUH). These letters have been introduced as oaths in fourteenth view i.e. these are oaths taken by Allah almighty. In fifteenth view these letters appear to be the life-time of the nations. On the basis of this view, some have asserted that the Muslim nation is to live till the doomsday. Researchers have however rejected this last view.

*. Chairman Albaseerah, Islamabad.

THE ROLE OF HAZARAT KHADEJA IN PROPAGATION OF ISLAM

By: Dr. Ansarruddin Madani [*]**,**
Muhammad Riaz, Fizza Muslim [*]
riaz.razee@yahoo.com

***Key Words**: Hazrat Khadeja, Mother of believers, Islam, Propagation of Islam, Dawat-e-zula'sherah, Defile of abi talib, Mgration to Hab;sha.*

Abstract:

The role of hazrat Khadeja in the propagation of Islam isunique, but, unfortunately her role hasn't been highlighted as it desiers. Hazrat Khadeja was so virtuous that she chose the holy prophet as her life-long partner. She has the honor of being the first whom the holy prophet informed her about his prophthood and she accepted his prophethood without any hesitation.She is amongst those who offered first of all their prayers with Holy prophet. The way she lived her life was similar to that of the prophet.

Her money and wealth was spent for the propagation of Islam, freedom of slaves, well-being of poor and orphans of Mecca. Her wealth also assisted the migrants of Haba'sha and the besieged people of the defile of Abi Talib (shi'ab-e-ibi talib). The details of her role in propagation of Islam have been described in this article.

*. Lecturar Quraqarm University, Gilgat.
*. Research Scholars at KU, Dep of Islamic Sciences; Karachi.

RELIGIOUS PLURALISM, A CRITICAL VIEW

By: ***Syed Ali Jawad Hamadani****
alihamadani@gmail.com

Key Words: *Pluralism, Religions, Skepticism, Relativism, Christianity, Islam, Imperialism.*

Abstract:

Religious pluralism is actually a scholastic theological concept of Christianity. According to the concept, all religions are true, authentic and guarantor of human solvation. This concept holds that truth or rightness is not specific to a particular religion, rather every religion has some truth and rightness and every religion is a way to reality.

This concept has a political history behind it. This concept is, on the one hand, a reaction to of the cruelty of medieval church that was fond of investigating people's beliefs. On the other hand, it is a conspiracy against Islam in modern era. Today, it is tried to create the same environment in the Muslim world that was prevail in medieval Christianity that provided the ground for secularism and religious pluralism. Anyhow, it is necessary to be aware of the concept, it roots and its applications. In fact, this concept is never acceptable from the viewpoint of Islam.

*. M.Phill Student at MIU, Qum, Iran.

THE SIGNIFICANCE OF UNITY AND DISADVANTAGES OF SCHISM

(IN THE LIGHT OF QURAN AND SUNNAH)

By :Ghulam Muhammad*
ghulammuhammadphd@gmail.com

Key Words*: Unity, Schism, Disadvantages, Robe of God, Unity among Muslims.*

Abstract:

Quran and Sunnah orders Muslims to be united and prohibits them from disunity. 'unity among Muslims' means mutual cooperation, avoidance of conflict, unified stance on issues, keeping capital and wealth away from using against each other, and maintain mutual understanding and sympathies in the face of enemies. The secret of Muslim unity, according to Quran, lies in to hold the 'robe of God' (Hablullah). Hablullah means holy Quran. Quran is, therefore, the center of Muslim unity and Muslims could be united on the established basis of Quran. And if the Muslims are united, Allah blesses them with power.

*. Research Scholars at KU, Dep of Islamic Sciences; Karachi.

PATIENCE AND TEMPERANCE

By: ***Syed Muzmmil Hussain Naqvi****
muzammilhussainnaqvi5@gmail.com

Key Words*: Psychological health, The power of patience, Great characteristics, Patience of the Imams, Dignity, Advantages of patience.*

Abstract:

To control the anger and the power of patience are called Hilm. The patience is a great attribute and person who adopts this becomes a reflectors of God's attributes. A patient person can safeguard himself against many negative passions and can improve his psychological health. God has described himself with this attribute (Haleem) eleven times in the holy Quran. Quran has ascribed Hazrat Abraham to the quality of patience and asked the holy prophet of Islam to acquire the same equality. According to traditions, patience is the greatest quality after knowledge. The lives of holy prophet and imams were full of patience and temperance as many narrations highlight. We can find many examples of patience in the lives of religious scholars as well. According to the holy prophet, following are the advantages of patience: good deeds, friendship with pious people, development in personality, freedom from humiliation, climbing to greater statuses, forgiveness, silence against ignorant people.

*. Director NDE. Barakhau, Islamabad.

THE WAYS OF FIGHTING ANXIETY IN THE LIGHT OF QURAN AND HADITH (2)

By: **Syed Aqeel Haider Zaidi***
aqeel.zaidi1968@gmail.com

Key Words: *Anxiety, Restlessness, Comfort, Faith, Trust on God, Wish, Razzaqiyyat, Asceticism, Patience, Mutual relations.*

Abstract:

Islam has blessed human beings with the basic methods of fighting every type of stress. It is indispensable to give up long desires. Similarly, a right and prudent reaction during unpleasant events and difficulties helps us eradicate anxiety and restlessness. One of the main reasons behind our mental stress is ignoring the facts. If we relate our lives with the facts of the world, it will be helpful in escaping from stress. It is the reality of the world that its happiness is tied to grief and sorrow. Another way of avoiding mental stress is to have good social relations. If we maintain good relations with our relatives, avoid jealousy and anger we can have a peaceful life without any stress.

*. P.hd. Student at Razavi University of Islamic Sciences, Meshhad, Iran.

THE CAUSES OF THE DOWNFALL OF THE MUSLIM UMMAH IN THE VIEW OF IMAM KHOMEINI

By: **Muhammad Furqan***
m.furqan512@gmail.com

Key Words: *Muslim community, Schism, Downfall, Religious scholars, Imperialist powers, Political crisis.*

Abstract:

Today Muslim ummah has lost its political leadership against western powers after a long period of its downfall. This is fact all sections of Muslim community embrace. In the current century, Imam Khomeini has struggled to uplift it and bring back its lost dignity through his qur'anic and divine thought. He has shown the path of restoring dignity to Muslim community after identifying the causes of its downfall. For Imam Khomeini, there are five prominent causes of the downfall of Muslim ummah and if Muslims enable themselves to eradicate the causes, they could very soon get out of this situation. The five causes are: first, disunity and schism among Muslims; second, lack of a political system that has caused political crisis; third and fourth, distance of Muslims from qur'anic culture and politics; lastly, the negative role of Muslim scholars.

*. M.Phill History of Islamic Civilization, MIU, Qum, Iran.

THE NATURE OF RELATIONS WITH NON-MUSLIMS IN THE LIGJHT OF ISLAM

By: ***Dr. Muhammad Afzal****
dr.muhammadafzalkarimi@gmail.com

Key Words*: Islam, Non-Muslims, Jews, Relations, Reconciliation, War, Bloodshed, the People of the book.*

Abstract:

Humen, being social by their nature, live a social life. Followers of all religions accept this fact. Anyhow, some people think Islam forbids all kinds of relationship with non-muslims; particularly with Jews and Christians. But, Islam, as a religion for all the mankind, demands relationship with all humenbeings of the world.

The only condition for this relationship is that never non-muslims should rule over the Muslims on the behalf such relations. Obeying this law, relationship with all non Muslims is desired. That is why, the holy prophet, his family members and companions had relations with Jews and Christians. There were trade agreements as well as war accords between Muslims and Jews. They were allies as well. The accord of Madinah is a proof in this regard.

This article attempts to seek the nature of the relations of Muslims with all non-muslims; particularly Jews and Christians.

*.KU; The Department of Islamic Sciences; Karachi.

سہ ماہی **نور معرفت**

ممبر شپ فارم

نام: _____ تعلیم: _____

پیشہ: _____ فون نمبر: _____

پتہ: _____

_____

E-mail: _____

براہ کرم سال _____ کے لئے نور معرفت میرے نام جاری کر دیجئے۔ شکریہ دستخط خریدار: _____

دفتری استعمال کے لئے

برادر/خواہر _____ کی ممبر شپ برائے سال _____ کی درخواست منظور کرتے ہوئے رجسٹریشن نمبر جاری کر دیا گیا ہے متعلقہ ممبر کو مجلّہ باقاعدگی سے ارسال کیا جائے گا۔

رجسٹریشن نمبر: _____ تاریخ اجراء: _____ ممبر ساز: _____

نوٹ: مجلّہ کا 2015ء کے لئے زرِ سالانہ مبلغ:/500 روپے اور فی شمارہ:/130 روپے ہے۔

خط وکتابت کا پتہ:

سہ ماہی نور معرفت/نوری الہدیٰ مرکز تحقیقات/نور الہدیٰ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

سادات کالونی/بارہ کہو اسلام آباد/فون: 051-2231937

www.nht.org.pk, www.nmt.org.pk

E-mail:noor.marfat@gmail.com

اعتراف گناہ اور طلب توبہ کے سلسلہ میں امام سجادؑ کی دعاء

اَللّٰهُمَّ اِنَّهٗ يَحْجُبُنِيْ عَنْ مَسْئَلَتِكَ خِلَالٌ ثَلَاثٌ وَ تَحْدُوْنِيْ عَلَيْهَا خَلَّةٌ وَاحِدَةٌ يَحْجُبُنِيْ اَمْرٌ اَمَرْتَ بِهٖ فَاَبْطَاْتُ عَنْهُ وَنَهْيٌ نَهَيْتَنِيْ عَنْهُ فَاَسْرَعْتُ اِلَيْهِ وَنِعْمَةٌ اَنْعَمْتَ بِهَا عَلَيَّ فَقَصَّرْتُ فِيْ شُكْرِهَا وَيَحْدُوْنِيْ عَلٰى مَسْئَلَتِكَ تَفَضُّلُكَ عَلٰى مَنْ اَقْبَلَ بِوَجْهِهٖ اِلَيْكَ وَ وَفَدَ بِحُسْنِ ظَنِّهٖ اِلَيْكَ اِذْ جَمِيْعُ اِحْسَانِكَ تَفَضُّلٌ وَاِذْ كُلُّ نِعَمِكَ ابْتِدَاءٌ فَهَا اَنَا ذَا يَا اِلٰهِيْ وَاقِفٌ بِبَابِ عِزِّكَ وُقُوْفَ الْمُسْتَسْلِمِ الذَّلِيْلِ وَسَآئِلُكَ عَلَى الْحَيَآءِ مِنِّيْ سَوَالَ الْبَآئِسِ الْبَعِيْلِ مُقِرٌّ لَكَ بِاَنِّيْ لَمْ اَسْتَسْلِمْ وَقْتَ اِحْسَانِكَ اِلَّا بِاِقْلَاعٍ عَنْ عِصْيَانِكَ وَلَمْ اَخْلُ فِي الْحَالَاتِ كُلِّهَا مِنْ اِمْتِنَانِكَ۔ فَهَلْ يَنْفَعُنِيْ يَا اِلٰهِيْ اِقْرَارِيْ عِنْدَكَ بِسُوْٓءِ مَا اكْتَسَبْتُ ؟ وَهَلْ يُنْجِيْنِيْ مِنْكَ اعْتِرَافِيْ لَكَ بِقَبِيْحِ مَا ارْتَكَبْتُ ؟ اَمْ اَوْجَبْتَ لِيْ فِيْ مَقَامِيْ هٰذَا سُخْطَكَ ؟ اَمْ لَزِمَنِيْ فِيْ وَقْتِ دُعَائِيْ مَقْتُكَ؟

یعنی : "اے اللہ ! مجھے تین باتیں تیری بارگاہ میں سوال کرنے سے روکتی ہیں اور ایک بات اس پر آمادہ کرتی ہے۔ جو باتیں مجھے تیری بارگاہ میں سوال کرنے سے روکتی ہیں اُن میں سے **ایک**، یہ کہ جس چیز کا تو نے حکم دیا، میں نے اس کی بجاآوری میں سستی کی۔ **دوسری**، یہ کہ جس چیز سے تو نے منع کیا میں اس کے ارتکاب کی طرف تیزی سے بڑھا۔ **تیسری**، یہ کہ جو نعمتیں تو نے مجھے عطا کیں، میں نے اُن کا شکریہ ادا کرنے میں کوتاہی کی۔ اور جو بات مجھے سوال کرنے کی جرات دلاتی ہے، وہ تیرا وہ فضل واحسان ہے جو تیری طرف رجوع کرنے والوں اور تجھ سے حسن ظن رکھنے والوں کے ہمیشہ شریک حال رہا ہے۔ کیونکہ تیرے تمام احسانات صرف تیرے تفضل کی بنا پر ہیں اور تیری ہر نعمت بغیر کسی سابقہ استحقاق کے ہے۔

اچھا پھر اے میرے معبود ! میں تیرے دروازہ عزوجلال پر ایک عبد مطیع وذلیل کی طرح کھڑا ہوں اور شرمندگی کے ساتھ ایک فقیر ومحتاج کی حیثیت سے سوال کرتا ہوں اس امر کا اقرار کرتے ہوئے کہ تیرے احسان کے وقت ترک معصیت کے علاوہ اور کوئی اطاعت نہ کر سکا اور ہر حالت میں تیرا انعام واحسان میرے شامل حال رہا۔

تو اے میرے معبود ! آیا میرا یہ بداعمالیوں کا اقرار مجھے کوئی فائدہ پہنچائے گا؟ اور آیا اپنے قبیح اعمال کا اقرار مجھے تیرے عذاب سے نجات دلائے گا؟ یا یہ کہ تو نے اس مقام پر مجھ پر اپنا غضب نازل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ اور آیا دعا کے وقت اپنی ناراضگی کو میرے لیے برقرار رکھا ہے؟

(صحیفہ سجادیہ؛ دعا نمبر ۱۲)

DECLARATION NO:7334 ISSN2221-1659

QUARTERLY

RELIGIOUS RESEARCH JOURNAL

NOOR-E-MARFAT

امت مسلمہ کے زوال اور انحطاط کے اسباب

"میری نظر میں اسلامی ممالک میں دو بڑی بنیادی مشکلیں پائی جاتی ہیں:

ایک مشکل، حکومتوں اور اقوام کے باہمی رابطے کی ہے۔ حکومتیں اپنی اقوام سے جدا ہیں۔ نہ حکومت اپنے آپ کو قوم کا حصہ سمجھتی ہے اور نہ ہی قومیں اپنے کو حکومت کا حصہ سمجھتی ہیں۔ اس مشکل کا حلّ حکومتوں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر حکومتیں اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ وہ اپنی قوم کی خادم ہیں تو قومیں بھی ان سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گی۔

دوسری مشکل، جو کہ ایک بنیادی مشکل ہے، خود حکومتوں کے باہمی رابطے کی ہے۔ اسلام نے اتحاد کی دعوت دی ہے۔ قرآن کریم نے مسلمانوں اور اہلِ ایمان کو بھائی قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ حکومتیں آپس میں اختلاف کا شکار ہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ دو حکومتیں- جو دونوں اسلامی ہیں، دونوں کی حقیقت ایک ہے، ان کا قرآن ایک ہے، پیغمبر ایک ہے- وہ اسلام کی اس دعوت پر لبیک کیوں نہیں کہتیں؟ وہ بھی ایک ایسی دعوت جو ان کے اپنے فائدے میں ہے، اگر یہ دعوت قبول کر لی جائے اور اسلامی حکومتیں آپس میں متحد ہو جائیں (اگرچہ ان کی سرحدیں اپنی جگہ محفوظ رہیں؛ فقط اتحاد ہی کر لیں) تو ایک ارب مسلمان، ایک عظیم طاقت بن کر سامنے آئیں گے۔"

امام خمینیؒ

نمت

نورالہدیٰ مرکز تحقیقات، نورالہدیٰ ٹرسٹ، محلہ سادات، بارہ کہو، اسلام آباد

Ph:051-2231937 www.nmt.org.pk|www.nht.org.pk